ترجمان اسلام

مفتی محمود

ایران کے بارے میں

امریکہ کی تازہ ترین حکمت عملی

تذکرہ تاج المحدثین

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری

علماء اور تعلیمیافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں

شمارہ ۴۸

قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسہ ۳۰ نومبر تا ۶ دسمبر ۱۹۷۹ء

محبت بھی چاہیے

انسان ہو تو خلق و مروت بھی چاہیے
آنکھوں میں شرم دل میں شرافت بھی چاہیے

ارباب انقلاب کا لازم ہے احترام
یعنی مجاہدوں سے محبت بھی چاہیے

احکام حال پر سر تسلیم خم مگر
ماضی کے مرحلوں کی حکایت بھی چاہیے

دیوانگانِ شوق بہت بے ادب سہی
ان بیکسوں پہ چشم عنایت بھی چاہیے

کب تک غلام گردش دوراں رہے کوئی
آزادیٔ نظر کی حفاظت بھی چاہیے

کرتے ہیں سب ہجوم مصائب میں بندگی
یادِ خدا بغیر ضرورت بھی چاہیے

دانش یہ کیسا جرم دعا کر لیا انہیں
کم بخت اپنے غم کی حفاظت بھی چاہیے

احسان دانش

ہفت روزہ
ترجمان اسلام
لاہور

جلد نمبر ۲۲ | شمارہ نمبر ۴۸
جمعۃ المبارک ۹ محرم ۱۴۰۰ھ، ۳۰ نومبر ۷۹ء

سرپرست
مولانا عبید اللہ انور

مدیر
اکرام القادری

مدیر معاون
عمیر الہاشمی

بدلِ اشتراک
سالانہ
۶۵ روپے
ششماہی
۳۳ روپے
سہ ماہی ۱۷ روپے
قیمت
ایک روپیہ پچاس پیسے
یکے از مطبوعات

خط وکتابت: ترجمانِ اسلام چوک رنگ محل لاہور

پرنٹر پبلشر مولانا عبید اللہ انور [illegible] لاہور

خانہ کعبہ پر مسلح افراد کا قبضہ

حرم شریف پر تقریباً دو سو نامعلوم مسلح افراد کے قبضہ کی خبرِ وحشت اثر نے پورے عالم اسلام میں غم و اندوہ کی لہر دوڑا دی ہے، خاص طور سے پاکستان کے غیور عوام نے اس خبر کے سنتے ہی کاروبارِ زندگی معطل کر کے سڑکوں پر نکل آئے اور انتہائی جوش و جذبات کے عالم میں امریکہ اور صہیونی طاقتوں کے خلاف بھرپور انداز میں اظہار رنج و غم کیا۔

تادمِ تحریر حرم شریف پر گمراہ اور شرپسند افراد کے قبضہ کی پوزیشن کے بارے میں کوئی واضح خبر موصول نہیں ہوئی۔ قبضہ کرنے والوں کی تعداد تک کے بارے میں مختلف اور متضاد خبریں آرہی ہیں۔ سو سے لے کر تین سو تک تعداد بتائی جارہی ہے اور ان مسلح افراد کے سرغنہ سے متعلق کہا جارہا ہے کہ اس نے امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے آپ کو قوت کے ذریعے منوانے کی غرض سے اس شخص نے یہ گھناؤنا راستہ اختیار کیا ہے کہ مسلح افراد کی مدد سے خانہ کعبہ پر قبضہ کر کے پوری دنیا میں کہرام برپا کر دیا جائے۔

بعض حلقے اس تمام تر صورت حال کو ایک گہری سازش کا نام بھی دے رہے ہیں جو بعید از قیاس نہیں۔ خاص طور سے ایران اور امریکہ کی موجودہ آویزش کے پس منظر کی روشنی میں دیکھنے والے حلقے اس واقعہ کو صاف طور سے صہیونی سازش اور امریکی پشت پناہی قرار دے رہے ہیں۔

ایران کے سب سے بڑے رہنما جناب آیت اللہ خمینی نے کھلے لفظوں میں بیت اللہ پر مسلح افواج کے قبضے کو امریکی اور صہیونی کرتوت قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس بعض مغربی ذرائع نے جواب آں غزل کے طور پر ان مسلح افراد کو آیت اللہ خمینی کے آدمی قرار دیا ہے۔

جبکہ حکومت سعودی عرب کے ترجمان نے ہر دو قسم کی قیاس آرائیوں کی تردید کی ہے اور مسلح افراد کو گمراہ و غدار قرار دیا ہے۔ پاکستان کے صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے بھی قوم سے اپنے نشریاتی خطاب میں ایسی قیاس آرائیوں سے محتاط رہنے کی تلقین کی ہے۔

گو ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ سے موصول ہونے والی خبروں میں یہی کہا جارہا ہے کہ صورتحال سعودی حکومت کے کنٹرول میں ہے۔ سعودی حکومت نے حرم شریف کو گھیرے

میں لیا ہوا ہے اور حالات ہر طرح سے قابو میں ہیں، مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ عالمِ اسلام کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

جناب صدر کی تقریر اور اخبارات کی سرخیوں سے کسی حد تک پاکستان کے مسلمانوں کے اشتعال میں کمی واقع ہوئی لیکن تشویش بڑھتی جا رہی ہے تاآنکہ گمراہ اور شرپسند مسلح افراد کو ان کے عبرتناک انجام تک نہ پہنچا دیا جائے اور اس گہری سازش کا انکشاف نہ ہو جائے۔

سعودی حکومت کی حکمت عملی اپنی جگہ درست ہوگی کہ مسلح افراد کو بغیر جانی نقصان کئے اور حرم مقدس کی حرمت کو مجروح ہونے سے بچاتے ہوئے قابو کر لیا جائے، مگر تاخیر بھی کچھ کم نقصان دہ اور تشویشناک نہیں ہے۔ پورے عالم اسلام کی نظریں اس وقت حرم شریف کی طرف لگی ہوئی ہیں اور وہ مسلح شرپسندوں کے عبرت انگیز خاتمہ کے بے تابی سے منتظر ہیں۔

مسلمانانِ عالم دل کی گہرائیوں سے دعائیں کر رہے ہیں کہ خداوند قدوس اپنے فضل و رحمت سے اپنے گھر کی حفاظت فرمائے اور مسلمانانِ عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مجتمع ہوں۔

اس میں اب کوئی شک نہیں رہا کہ عالمِ اسلام کی بیداری سے مغربی طاقتیں اور اسلام دشمن عنصر پریشان اور مشوش ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ عالمِ اسلام ایک مرتبہ پھر اپنے شاندار ماضی کی طرف قیادت و سیادت کے منصب پر جلوہ فگن ہو، اور اسلام کے ابدی اصولوں کی روشنی میں کرب و بے چینی اور بدامنی بدحالی میں مبتلا دنیا کی رہنمائی کرے، اور دنیا پر یہ واضح کرے کہ آج کے متمدن دور میں صرف اور صرف اسلام ہی ایسا دین برحق ہے جو سسکتی ہوئی انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھ سکے۔

اسلام دشمن قوتیں اسلام کے روشن اور درخشاں مستقبل سے لرزہ براندام ہیں۔ انہیں ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں ان کی منافقانہ سیادت کے کھوٹے سکے کا بھرم نہ کھل جائے اور ترقی پذیر ممالک ان کی قیادت و رہنمائی کا جوا اپنی گردن سے اتار کر نہ پھینک دیں۔

عالمِ اسلام کی طرف سے منائی جانے والی پندرھویں صدی ہجری کی دوسالہ تقریبات کے آغاز میں ہی حرم مکرم پر مسلح افراد کے قبضہ کو محض چند گمراہوں کی مذموم کوشش کہہ کر رفت و گزشت نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے درپردہ عوامل کا کھوج لگا کر آئندہ کے لئے مزید چوکنا رہنا ہوگا۔ اور صرف چوکنا رہنے سے بھی بات نہیں بنے گی۔ اس کے لئے عالم اسلام کو منظم اور مربوط تیاریوں کی ضرورت ہوگی۔

اس دور کا تقاضا یہ ہے کہ عالمِ اسلام اپنی توانائیوں کو مجتمع کر کے مثبت اور پائیدار مقاصد کے لئے بروئے کار لائے۔

جہاں تک عالم اسلام کے وسائل کا تعلق ہے تو اس میں قدرت نے بخل سے کام نہیں لیا۔ عالم اسلام کے قدرتی وسائل اس قدر ہیں کہ کوئی دوسری قوم ہمسری کا دعوے نہیں کر سکتی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری غفلت، لاپرواہی، عیش کوشی تعیش پسندی اور کام چوری بھی ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے وسائل بھی دشمنوں کے کام آ رہے ہیں اور ہماری بجائے ہمارے مخالف ان سے استفادہ کر رہے ہیں اور ہم ہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

گذشتہ چند سالوں سے عالم اسلام میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی جو امنگ کروٹ لے رہی ہے وہ یقیناً قابلِ ستائش اور لائق صد تحسین و آفرین ہے، مگر اس کے لئے عالمِ اسلام کو اپنے معمولی تنازعات کو فراموش کر کے اجتماعی مفادات کے لئے سوچنا ہوگا۔

اور صرف سوچ سے بھی بات نہیں بنتی۔ اس کے لئے جدوجہد اور جانفشانی کی پُرخطر راہ کو اپنانا ہوگا اور مسلسل اس راہ پر چلنا ہوگا۔ حرم پاک پر مسلح افراد کے اس دیدہ دلیری سے قبضے کے بعد کم از کم ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں، بالکل اسی طرح جس طرح دشمنانِ اسلام ایران، افغانستان اور پاکستان میں اسلامی انقلاب کی آوازوں نے عالم اسلام کے دشمنوں کا خواب خود حرام کر دیا ہے اور وہ نت نئی سازشوں کے منصوبے تیار کر رہے ہیں۔

تازہ اطلاعات کے مطابق سعودی حکومت نے خانہ کعبہ پر قابض مسلح افراد کو گرفتار کر لیا ہے اور حرم پاک کو ان سے خالی کرا لیا ہے۔ یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے گا کہ ان افراد کا حدود اربعہ کیا ہے اور ان کے ڈانڈے کہاں ملتے ہیں۔ آئندہ بھی سعودی حکومت کو احتیاط کے تقاضے ملحوظ رکھنے چاہئیں، اور مکمل طور پر چوکنا رہنا چاہئے اور مسلمانانِ عالم اسلام کو اسی بارگاہ قدس میں سجدۂ شکر ادا کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہئے۔

مولانا غلام اکبر سلیمانی کا ملاقاتی دورہ

مولانا غلام اکبر سلیمانی یکم دسمبر سے دوستوں اور ساتھیوں سے ملاقات کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔ ملک بھر کے احباب مطلع رہیں۔ (ابو عمار زاہد الراشدی)

زاہد بلند شہری

ایران کے بارے میں

امریکہ کی تازہ ترین حکمت عملی

امریکہ کے صدر جمی کارٹر نے ایران کو انتباہ کیا ہے کہ وہ امریکی یرغمالیوں پر مقدمہ نہ چلائے۔ محکمۂ خارجہ کے حکام نے پہلی مرتبہ اشارتاً بتایا ہے کہ صدر کارٹر امریکی سفارت خانے پر اٹھارہ روزہ قبضہ ختم کرانے کے لئے ایران کے خلاف فوجی طاقت استعمال کرنے پر غور کر رہے ہیں۔ صدر اس سے قبل بحریہ کی ٹاسک فورس کو بحرِ ہند میں بھیجنے کے احکامات دے چکے ہیں۔ یہ ٹاسک فورس دو طیارہ بردار جہاز کٹی ہاک اور کیری مڈوے پر مشتمل ہے جن پر ۸۵ طیارے ہیں اور ان کے ساتھ پانچ دیگر جنگی جہاز بھی ہیں۔ امریکی محکمہ دفاع کے حکام نے بتایا ہے کہ ایک طیارہ بردار جہاز کو جس کے ہمراہ جنگی جہاز بھی ہیں فلپائن سے بحرِ ہند کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا جا چکا ہے۔ فوجی مبصرین کا کہنا ہے کہ امریکہ کے اس اقدام کا مقصد ایران کو امریکہ کی فوجی قوت سے مرعوب کرنا ہے۔

اسی ضمن میں امریکی محکمۂ خارجہ نے بتایا ہے کہ:

بحران کو ختم کرنے کے لئے امریکی صدر کارٹر نے اپنی پالیسی میں نظرِثانی کی ہے۔ اور وہ آیت اللہ خمینی کے اس انتباہ کے بعد کردہ باقی ماندہ ۴۹ امریکی یرغمالیوں پر جاسوس ہونے کے الزام میں مقدمہ چلائیں گے، اس مسئلے کو فوجی طاقت کے ذریعہ حل کرنا چاہتے ہیں۔"

آج سے ۱۹ دن قبل جب ایرانی طلباء نے سفارت خانے پر قبضہ کیا تھا تو غالب امکان یہی تھا کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ نہیں ہے، نیز یہ کہ ایرانی حکومت کی مداخلت سے قبضہ خالی کرالیا جائے گا۔ مگر اس قبضہ کی صورتحال اس وقت تشویشناک ہو گئی جب ایرانی حکومت کو یہ پتہ چلا کہ امریکی سفارت خانہ سفارتی سرگرمیاں کم اور جاسوسی زیادہ کرتا ہے تو ایرانی حکومت نے قبضہ ختم کرانے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ نیز یہ کہ اب ایرانی حکومت کے سرکردہ لیڈر آیت اللہ روح اللہ الخمینی نے قبضہ ختم کرانے کے لئے امریکی حکومت کو واحد شرط پیش کی ہے۔ اس شرط کے مطابق اگر امریکہ سابق شاہ ایران کو ایرانیوں کے حوالے کردے تو ایرانی مسلح طلباء امریکی سفارت کاروں کو رہا کر دیں گے۔

اس کے برعکس امریکی حکومت اپنے اس موقف پر سختی سے ڈٹی ہوئی ہے کہ سابق شاہ کو ایرانیوں کے حوالے نہیں کیا جائیگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صورت حال کو مخدوش بنانے میں سراسر امریکی حکومت کا ہاتھ ہے کیونکہ بقول ایرانیوں کے سابق شاہ کو علاج معالجے کے بہانے امریکہ میں غیر قانونی پناہ دی گئی ہے۔

یہ ابھی تک پتہ نہیں چل سکا کہ امریکہ سابق شاہ کو امریکہ میں پناہ دے کر کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ امریکی حکومت اس طرح سے محض ایرانیوں کے جذبات سے کھیلنا چاہتی ہے۔ تاہم اس کے علاوہ بھی بین الاقوامی سیاست پر نظر رکھنے والوں کا تجزیہ یہ ہے کہ امریکہ ایران میں غیر یقینی صورت حال غیر منتخب حکومت کی موجودگی اور انتظامی صورتِ حال کی غیر منتظمی سے فائدہ اٹھا کر وہاں خالصتاً مغربی ذہنیت کے لوگوں کو یا دوسرے لفظوں میں شاہ پسندوں کے مختصر ٹولے کو دوبارہ برسرِ اقتدار لانا چاہتا ہے اور پھر جب امریکہ اپنے اس مذموم

مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو سابق شاہ رضا کو نئے سرے سے تخت نشین کرے گا۔ شاہ پسند ٹولے کو دوبارہ ایران کے انتظام و انصرام میں دوبارہ دیکھنے کا واحد مقصد امریکہ اور اسرائیل کے ان مقاصد اور فوائد کا حصول ہے جو شاہ کی معزولی کے بعد سے ختم ہو گئے تھے۔

بحرین میں امریکی اڈے کی موجودگی

ان میں سب سے بڑا مقصد بحر ہند اور خلیج عرب (خلیج فارس) میں امریکی اڈے کے قیام کے امکانات اور بحرین میں سابق برطانوی فوجی اڈے کے ذریعے عربوں کو طاقت کے استعمال سے بلیک میل کرنا ہے۔ امریکی سفارت کاروں کو یرغمال بنائے جانے کے چند روز بعد بحرین نے امریکہ کو بحرین میں اپنا فوجی اڈا استعمال کرنے سے منع کر دیا۔ اس طرح اس نے نہ صرف عربوں کا تحفظ کیا بلکہ اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے بری ذمہ ہو گیا جو بحرین کے فوجی اڈے کے استعمال کے بعد بحرین پر عائد ہوتی۔ بحرین کے امریکی فوجی اڈے کی زد میں نہ صرف یہ کہ ایران اور خلیج کی ریاستیں آتی ہیں بلکہ یمن (شمالی + جنوبی) سلطنت اومان، کویت بھی اس اڈے سے محفوظ نہیں ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر اس فوجی اڈے سے سعودی عرب کو سب سے بڑا خطرہ ہے۔ سعودی عرب کی بحری سرحد جہاں خلیج عرب سے بحرین سے ملتی ہیں وہاں اسرائیل سے بھی اس کا فاصلہ زیادہ نہیں ہے اور درحقیقت بحرین کا امریکی اڈا بحر ہند میں بھی اثر و رسوخ کو ختم کرنے کے لئے نہیں بلکہ سعودی عرب کو عسکری طور پر گھیرے میں لینے کے مترادف ہے، اور اب اگر جیسا کہ ایران سے ملنے والی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ ایرانی طلبہ امریکی حملے کی صورت میں تمام محصور امریکیوں کو ہلاک کر دیں گے امریکی بحری بیڑے کے بحر ہند اور بحیرہ عرب کی جانب پیش رفت کا واحد مقصد ایران میں محصور امریکی یرغمالیوں کی رہائی کے ساتھ ساتھ صورت حال اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دیرینہ مذموم مقصد یعنی عرب ریاستوں اور ایران کے تیل کے چشموں پر قبضہ کو پورا کرنا ہے۔

روس کے وزیر خارجہ مسٹر آندرے گرومیکو نے مغربی جرمنی کے دارالحکومت بون کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے کہا کہ

"ایران کے حالات خالصتاً اس کا اندرونی معاملہ ہے۔"

ایران میں امریکی سفارت خانے پر ایرانی طلباء کے قبضہ کے بعد سے آج تک یہ واحد بیان ہے جو روسی حکومت کے کسی مقتدر عہدیدار نے ایرانی صورت حال کے بارے میں دیا ہے۔ گرومیکو نے مزید کہا کہ روس ایران میں غیر ملکی مداخلت برداشت نہیں کرے گا۔

آندرے گرومیکو کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ روس ایران کی صورت حال سے گو کہ فی الحال کوئی فائدہ اٹھانے کے حق میں نہیں ہے، مگر افغانستان میں روسی پالیسی مسلط کرنے والے ٹولے کی اندرونی افغانستان اور ایران و پاکستان کی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ اور بے بنیاد الزام تراشیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا بعید از قیاس نہیں کہ اگر امریکہ نے ایران میں فوجی مداخلت کی تو روس بھی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بحر ہند تک خشکی کا راستہ تلاش کرنے کا کوئی بھی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا اور اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تیسری عالمی جنگ شروع ہو جائے گی۔

خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو پاکستان کو اپنا کردار ادا کرنا ضروری ہو جائے گا، اور اب تک کی اطلاعات سے جیسا کہ پتہ چلتا ہے کہ امریکی بیڑا (مع طیاروں کے) بحر ہند کی طرف بڑھ رہا ہے تیسری عالمی جنگ کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ پاکستان مستقبل سے نمٹنے کے لئے ابھی سے ایسی پالیسی مرتب کرے جس سے نہ صرف پاکستان بلکہ تمام عالم اسلام کے تحفظ کی ضمانت ملتی ہو۔

قارئین متوجہ ہوں!

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہو گا کہ سنسرشپ کی پابندیوں کی وجہ سے شمارہ ہذا اپنے وقت سے خاصا لیٹ ہے۔ ادارہ اس سلسلے میں قارئین سے معذرت خواہ ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں

یہ تقریر جامع مسجد فیصل آباد میں ۲۲ جولائی ۱۹۷۸ء کو علماء جدید تعلیمی اداروں کے اساتذہ، معززین شہر اور مختلف دینی، سیاسی، سماجی، علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں کے ذمہ دار حضرات کے ایک مخصوص و منتخب جلسہ میں کی گئی۔

اس وقت علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ جب کسی دعوت یا کوشش کے ساتھ اعلیٰ طبقہ کے وہ لوگ جو ذہین اور صاحب فکر سمجھے جاتے ہیں اور جو دین کا گہرا علم رکھتے ہیں ہوتے ہیں تو اس میں سنجیدگی، گہرائی اور پختگی ہوتی ہے اور اس کے بارے میں یہ امید ہوتی ہے کہ وہ کسی غلط راستے پر نہیں پڑے گی۔ اس تحریک میں جذباتیت نہیں ہوگی۔ اس میں عامیانہ مبتذل انداز نہیں ہوگا۔ اس وقت عالم اسلام میں علماء کی اور دینی جماعتوں اور قائدین کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ ذمہ داری ہر زمانے میں زیادہ رہی ہے، لیکن اس زمانے میں وہ خاص طور پر بہت عظیم بن گئی ہے کہ وہ صحیح رہنمائی کریں گے اور تحریک دعوت اور جدوجہد کو سطحیت سے بچائیں گے۔ اس کے متعلق یہ تصور اور یہ تاثر قائم نہ ہونے دیں گے کہ دریا کا حباب ہے بلکہ اس کے متعلق یہ تاثر دیں گے کہ اس کی جڑیں گہری اور علم دین کی زندگی میں پیوست ہیں۔

مسلم حکومتوں میں علماء کا کارنامہ:

خلافت بنو امیہ وخلافت بنی عباس کی پشت پر اگر علماء و مجتہدین نہ ہوتے تو اسلام بہ حیثیت نظام حیات کے ایک مرتب و مدون قانون کی شکل میں موجود نہ ہوتا۔

تاریخ میں ان لوگوں کی خدمات کو سراہا جاتا ہے جو ملک فتح کرتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے قائدین طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، عقبہ بن نافع، موسیٰ بن نصیر وغیرہ حضرات کی خدمات روز روشن کی طرح تابناک ہیں لیکن جو لوگ مفتوحہ ممالک میں اللہ کے قانون کو رائج کرتے تھے اور وہاں کی مشکلات و مسائل کو حل کرتے تھے وہاں کی پیش آمدہ ضروریات کی تکمیل کرتے تھے نئے نئے حالات جو پیدا ہوتے تھے ان میں رہنمائی کرتے تھے ان کی خدمات کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ حالانکہ اگر ائمہ مجتہدین محدثین عظام اس زمانے میں رہنمائی کرتے اور ان کا دماغ اس تلوار کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک کو فتح کرتی تھی اور اس حکومت کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک میں نظم و نسق قائم کرتی تھی تو یہ سب کوششیں فتوحات اور سلطنتیں بالکل کھوکھلی تھیں۔

مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح:

مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ تاتاریوں نے عالم اسلام کو زیر و زبر کر ڈالا۔ عالم اسلام کی چولیں ہلا دیں۔ اس وقت مسلمانوں سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں تھا۔ آپ اس زمانے کی تصاویر دیکھیں جو آثار قدیمہ میں ملتی ہیں تو ان سے اندازہ ہوگا کہ کسی مسلمان کی داڑھی کسی گھوڑے کی دم سے بندھی ہے اور ایک تاتاری اسے کھینچے لئے جا رہا ہے۔ دنیا کی ہر قوم ان کی نگاہ میں عزت رکھتی ہے لیکن مسلمانوں سے زیادہ کوئی ذلیل نہ تھا اور خاص طور پر اس خطۂ زمین کے مسلمان جو مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہ چکا تھا یعنی ایران اور ماوراء النہر کا علاقہ جو آخر میں فقہ کا (خاص طور سے فقہ حنفی) کا مرکز رہا ہے لیکن آپ حضرات اس سے واقف ہیں کہ وہی تاتاری جو مسلمانوں کے فاتح تھے اسلام کے مفتوح بن گئے اور جن کو مسلمانوں کی تلوار شکست نہ دے سکی، ان کو مسلمانوں کی تہذیب نے مسلمانوں کی ثقافت نے، مسلمانوں کے علم نے تسخیر کر لیا اور ان کو اپنا بے دام غلام بنا لیا۔ بات یہ تھی کہ تاتاریوں کے پاس کوئی علمی ذخیرہ، کوئی شائستہ تہذیب اور کوئی مرتب و وسیع قانون نہ تھا۔ ان کا ایک سیدھا سادا روایتی قانون تھا جو قبائلی زندگی میں رائج تھا اور کوہ قراقرم اور اس کے اطراف میں اس کا عمل دخل تھا۔ نیم وحشی اقوام میں جیسے

"عرف" ہوتے ہیں وہ ویسے تھے۔ ان کے پاس کوئی آئین، کوئی تہذیب، کوئی لٹریچر نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مسلمان علماء اور دانشوروں کی ضرورت پڑی۔ مسلمان علماء اور دانشور جب ان کے دربار میں پہنچے تو ان کی علمیت کا، ان کی ذہانت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ اسلامی تہذیب نے ان کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاتاری من حیث القوم مسلمان ہوگئے۔ مسلمان چونکہ صاحب دماغ تھے۔ ان کے پاس ذہانت کے سرچشمے تھے، ترقی یافتہ تہذیب تھی، ایک وسیع ثقافت اور علمی ذخیرہ تھا، وہ آئین سازی کا تجربہ رکھتے تھے، تمدنی مشکلات و مسائل کو حل کرسکتے تھے۔ تاتاریوں کو ان کی ضرورت پیش آئی۔ فلسفہ تاریخ کا یہ ایک اہم اصول ہے کہ جنگی طاقت اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک اس کے پیچھے دماغ نہ ہو، آئین سازی کی طاقت نہ ہو اور کوئی منظم ادارہ نہ ہو۔

یہ دین جہالت سے نہیں بلکہ علم سے پیدا ہوا ہے:

عصر جدید میں عالم اسلام کے علماء، جامعات کے اساتذہ اور پروفیسر صاحبان اور ہمارے قانون دان اور ہمارے ادیب و دانشور طبقہ کی ایک ذمہ داری تو یہ ہے کہ وہ ثابت کریں کہ یہ دین جہالت کے بطن سے اور فوجی طاقت سے نہیں پیدا ہوا ہے۔ معرفت سے پیدا ہوا ہے اللہ کی راہنمائی سے پیدا ہوا ہے وحی سے پیدا ہوا ہے۔ یہ زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے۔ یہ تمدن کی رہنمائی کرسکتا ہے، اس کی نگرانی کرسکتا ہے کہ یہ تمدن بے راہ نہ ہونے پائے، فاسد نہ ہونے پائے، تخریبی راستہ اختیار نہ کرنے پائے۔ یہ تاثر علماء دین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی دے سکتا ہے اور یہ بڑی ذمہ داری ہے۔ اگر کسی دین یا قوم کے متعلق یہ خیال قائم ہوجائے کہ اس کا علم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے بلکہ علم سے اس کو نقصان پہنچتا ہے اور جہالت سے اس کو فائدہ تو خواہ تھوڑے عرصے کے لئے اپنے زور شمشیر اپنے بازو سے وہ دعوت یا جماعت یا قوم دنیا کے کسی حصے پر قبضہ کرلے لیکن دماغوں پر اس کا قبضہ نہیں ہوسکتا۔ سب یہی خیال کریں گے کہ اس کو زندہ رہنے کے لئے جہالت کی تاریکی چاہیئے۔ جب تک وہ تاریکی رہے گی وہ زندہ رہے گا اور علم آئے گا وہ غائب ہوجائے گا اس کا پردہ چاک ہوجائے گا اور جس طرح بدلی آفتاب کی روشنی سے چھٹ جاتی ہے اسی طرح وہ چھٹ جائے گا۔ عیسائیت کا معاملہ یہی ہوا۔ عیسائیت نے علم کا ساتھ نہیں دیا۔ عیسائیت ایک خاص روحانی تحریک اور ایک معاشرتی انقلاب کے طور پر تو آئی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا جب تک زمانہ رہا، انکی مقبولیت ان کا تقدس ان کی روحانی طاقت رہنمائی کرتی رہی لیکن اس کے بعد پھر اس کو ایک زمانہ تک ذہین اور صاحب نظر لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہوا۔ پھر جب مسیحیت یورپ پہنچی تو سمجھا گیا کہ یہ زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس لئے زندگی سے اس کو علیحدہ کرلینا چاہیئے۔

عیسائیت مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی:

یورپ اس وقت ترقی کررہا تھا۔ یورپ کے اندر ترقی کی طاقتیں اور ولولے جوش مار رہے تھے۔ یورپ میں تنازع اللبقاء کیلئے سخت کشمکش تھی۔ ان کی پلک ذرا جھپک جاتی تو یہ قوم کی قوم بالکل مغلوب ہوجاتی۔ عیسائیت جو ابھی بالکل اپنے دور طفولیت میں تھی جس کی ابھی نہ تدوین تھی نہ تشریح نہ اس کے پاس آئین تھا۔ آئین میں وہ سارا انحصار یہودیت پر کرتی تھی۔ یہ مسیحیت اپنے ساتھ کوئی مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی۔ شریعت موسوی تھی جس میں جزوی تبدیلی کی گئی تھی وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ کہا گیا ہے کہ میں تمہارے لئے مستقل شریعت لے کر آیا تو جو چیزیں یہودیت میں غلط طور پر داخل ہوگئی تھیں مسیحیت ان کی اصلاح کرتی تھی۔ اس کے پاس کوئی مستقل آئین نہیں تھا اور اس کا زیادہ زور رحم پر محبت پر انسان دوستی پر، مظلوموں پر شفقت پر، اجارہ داری اور اس کے غرور کو ختم کرنے پر تھا۔ جب یورپ جیسے بے چین ملک اور وہاں کی بے چین قوموں میں جو زندگی کے لئے دوڑ رہی تھیں مچل رہی تھیں عیسائیت پہنچی تو یہ حقیقت بہت جلد منکشف ہوگئی کہ عیسائیت بدلتے ہوئے زمانے دوڑتے ہوئے معاشرے اور ابلتے ہوئے علم کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح مسیحی علماء کی بہت بڑی ذمہ داری تھی کہ وہ مسیحیت کی افادیت کو ثابت کرتے اور راہنما اصول دیتے۔ زمانہ کے جائز تقاضوں اور فطرت انسانی کی جائز خواہشات کو قبول کرتے اور کہتے کہ یہ ٹھیک ہے لیکن اس کے ساتھ مذہب کی ہدایت اور نگہبانی چاہیئے۔ یہ انہوں نے نہیں کیا۔ وہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ حاکمانہ گروہ نے مسیحیت کو بس عقیدہ کے طور پر قبول کیا اور باقی زندگی کو آئین کو آئین سازی کی کھلی چھوٹ دے دی۔ دوسرا طبقہ علماء کا تھا۔ انہوں نے مخالفت شروع کردی اور کہا ترقی ضروری نہیں ہے بلکہ ترقی زندگی سے فرار میں ہے، کلیساؤں میں جانے میں، جنگلوں میں چھپ جانے میں، شادی نہ کرنے میں، ازدواجی زندگی سے منہ موڑ لینے میں، عورت کے سایہ سے بھاگنے میں ہے اور اسی میں روحانیت کا بچاؤ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طبقوں نے عیسائیت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچایا۔ جو حاکم طبقہ تھا اس نے آزادی کے ساتھ اپنے تمدن کا ڈھانچہ بنانا شروع کیا، لوگوں کو غلام بنانا شروع کیا جو مسیحیت کی تعلیم کے خلاف تھا۔ اس نے مسیحیت کو بدنام کیا۔ سینٹ پال کے زمانہ سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور تقریباً چوتھی صدی

عیسوی سے آج تک جاری ہے یورپ اسی راستے پر گامزن ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے کلیسا سے رشتہ توڑ لیا۔ کلیسا اور ریاست میں ہمیشہ کے لئے جدائی ہوگئی اور عیسائیت سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ ہوگئی۔

اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے:

یہ غلطی عالمِ اسلام میں الحمدللہ نہیں ہونے پائی۔ اس لئے کہ شروع سے اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ میں نے کراچی یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ پہلی وحی اقراء کے لفظ سے شروع ہوئی ہے اور جس کی پہلی وحی میں قلم کو فراموش نہ کیا گیا ہو اور قلم کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ اسلام میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دین و علم میں کبھی بھی دوری ہوگی۔ اس لئے کہ اسلام اور علم کا شروع سے ساتھ رہا ہے۔ جب بدر کے قریشی قیدی مدینہ پہنچے تو ان میں کئی ایسے تھے کہ وہ فدیہ ادا کر کے رہائی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ ہر شخص انصاریوں اور مہاجرین کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔

اسلام زمانہ کا رفیق ہی نہیں بلکہ راہنما ہے:

اس وقت عالمِ اسلام میں اہلِ علم کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ تھی کہ یہ تاثر نوجوان طبقہ میں نہ آنے پائے کہ اسلام محض طاقت اور حکومت کے بل پر قائم رہ سکتا ہے۔ وہ زمانہ کی تبدیلیوں اور علم و فن کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ اس زمانے میں چلنے والی چیز نہیں۔ وہ ابتدائی سادہ اور محدود زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے جب انسانیت عہدِ طفولیت میں تھی لیکن اس پُر پیچ ترقی یافتہ اور وسیع تمدن کے دور میں اسلام زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ سب سے بڑی خدمت علماء کی یہ تھی کہ اسلامی ملکوں میں اس چیلنج کو قبول کرتے اور اپنی ذہانت سے گہرے مطالعہ سے اصولِ فقہ سے کام لینے کی صلاحیت سے کتاب و سنت کے ان ازلی اور لافانی اصولوں کی مدد سے جو ہر زمانے میں نسلِ انسانی کی رہنمائی کر سکتے ہیں اس تمدن کو اسلام کے اصولوں کے مطابق رکھنے کی کوشش کرتے۔ اس میں اگر کسی ملک میں ذرا بھی کچھ کمی ہوگی اس کا نتیجہ کم سے کم جو ہو سکتا ہے وہ عملی اور شریعت کے خلاف زندگی ہے وہ بڑے سے بڑا نقصان جو ہو سکتا ہے وہ الحاد اور دین سے بغاوت ہے۔ کسی اسلامی ملک میں آپ دیکھیں گے کہ دوسرا نتیجہ ظاہر ہوا اور کسی اسلامی ملک میں آپ دیکھیں گے کہ پہلا نتیجہ ظاہر ہوا۔ حالانکہ دونوں نتیجے اسلام کے حق میں سم قاتل ہیں۔ سب سے بڑا کام اس وقت یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ اسلام اپنی اس روح اور مقاصد کے ساتھ اور اپنے نفیس اصولوں کے ساتھ زندگی کا نہ صرف ساتھ دے سکتا ہے بلکہ راہنمائی کر سکتا ہے۔ ساتھ دینا تو میں نے علی السبیل التنزل کہا وہ تو بہت ہی گھٹیا درجہ ہے۔ یہ اسلام کی کوئی تعریف نہیں ہے کہ وہ زندگی کا ساتھ دے سکتا ہے نہیں بلکہ وہ نئی زندگی کی راہنمائی کر سکتا ہے۔ اس کو خطروں سے صرف وہی بچا سکتا ہے اور وہ تمدن صحیح انسانی تمدن نہیں اور وہ ریاست معتدل اور محفوظ ریاست نہیں جو اسلام کے اصولوں سے ہٹ جائے، یہ ثابت کرنا ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

اسلام کو ہر مفاد پر ترجیح دیجئے:

علماء اور دانشوروں کا دوسرا فریضہ یہ ہے کہ اسلام کے مفاد کو ہر جماعت ہر ادارہ ہر مدرسہ اور ہر گروہ کے مفاد پر ترجیح دیں۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر ہمیں معلوم ہو کہ سب جماعتوں کو مٹا دینا پڑے گا، سارے نشانوں کو نکال دینا پڑے گا، سارے ناموں کو ختم کر دینا پڑے گا، سارے بورڈوں کو ہٹا دینا پڑے گا اور اسلام اس ملک میں غالب رہے گا تو ہمیں ایک منٹ بھی اس میں پس و پیش نہیں ہونا چاہئے، ہمیں دین و ملت کا مفاد ہر جماعت سے عزیز ہونا چاہیئے۔ سہرا کسی کے سر بندھے سہرا ہونا چاہیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ یہ تھا کہ صحابۂ کرام کے دل سے یہ شوق نکل گیا تھا کہ ان کا کارنامہ سمجھا جائے۔

بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ایک مجلس میں واقعہ کے طور پر ذکر کیا کہ ہم لوگ ایک غزوہ میں گئے تھے۔ وہاں ہمارے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ ہم نے چیتھڑے لپیٹ لئے۔ اسی وجہ سے وہ غزوہ ذات الرقاع کہلاتا ہے۔ یہ کہنے کے بعد ان کو ایک دم سے یہ احساس ہوا کہ میں نے یہ کیوں کہا۔ کہیں میرا یہ عمل باطل نہ ہو گیا ہو، کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نہ کہہ دیا جائے کہ لوگوں نے سن لیا اور بڑا کارنامہ سمجھا۔ یہ کافی ہے اب ہم سے کیا لینے آئے ہو۔ تو بخاری شریف میں خاص طور سے ہے کہ انہوں نے کہا کاش میں یہ نہ کہتا کہ اس کا افسوس رہا، آج اس بات پر زور ہے کہ یہ کارنامہ کس کی طرف منسوب ہوگا۔ ایک صاحب تھے غازی محمود دھرم پال، آپ ہی کے پنجاب کے تھے مجھے ان کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک تقریر میں کہنے لگے کہ اخباروں میں چھپتا ہے کہ فلاں آدمی فلاں صاحب کے دستِ حق پرست پر اسلام لایا تاکہ اس کے اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان کے دستِ حق پرست کی بھی شہرت ہو جائے بلکہ دستِ حق پرست کی شہرت زیادہ منظور ہے قبول اسلام کی شہرت ہو یا نہ ہو۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ کسی بڑے آدمی کا جنازہ ہوتا ہے لپک کر پہنچ جاتے ہیں جنازے کی نماز پڑھانے کے لئے اس لئے کہ کل اخبار میں یہ خبر چھپ جائے گی۔ یہ جذبہ بڑا نقصان پہنچاتا ہے۔ دیکھئے جب کسی کا

عزیز جاں بلب ہوتا ہے تو اس کے عزیزوں میں کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ تعریف کس کی ہو۔ سب کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ہمارا مریض بچ جائے، حکیم کے سر سہرا بندھے یا ڈاکٹر کے، تو اسوقت عالم اسلام بیمار ہے، آپ کا ملک بیمار ہے آپ اس وقت بھول جائیے کہ کس کے حساب میں لکھا جائے گا اور تاریخ میں لکھنے والے کیا لکھیں گے کہ اس ملک کو سب سے زیادہ نفع فلاں ادارہ فلاں جماعت سے پہنچا اور اس میں سب سے بڑا حصہ کس کا تھا۔ اس لئے کہ اس ملک کو سب سے زیادہ نفع فلاں ادارہ فلاں جماعت سے پہنچا اور اس میں سب سے بڑا حصہ ان کا تھا۔ تاتاریوں کے بارے میں آجتک یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ ان کو مسلمان کرنے میں سب سے بڑا حصہ کس کا تھا۔ اس لئے کہ ان مخلصین نے جنہوں نے یہ خدمت انجام دی تھی اپنے کو اتنا چھپایا کہ تاریخ کی باریک بین نگاہ بھی ان کو نہیں دیکھ سکی۔

اس وقت جو لڑائی لڑی جا رہی ہے اس ملک کو اسلامی آئین کی اسلامی معاشرت و تمدن میں ڈھالنے کی اور یہاں سے ان خرابیوں کو دور کرنے کی جو مغربی تمدن نے اور ہمارے سیاستدانوں نے داخل کر دی ہیں۔ اس لڑائی میں فوج کے ادنیٰ سپاہی بن جائیں۔ خالص اللہ کی رضا کے لئے کام کیجئے۔ اللہ کے یہاں آپ کا نام اس نورانی دفتر میں لکھا جائے گا۔ یہاں ہوا تو کیا اور نہ ہوا تو کیا۔

اس وقت لڑائی کسی مکتب خیال کی نہیں ہے۔ اسوقت لڑائی اسلام اور غیر اسلام کی ہے۔ اس طرح سمجھئے کہ ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے اس میں جو بھی شریک ہو جائے سب اجر میں شریک ہوں گے۔ اس میں یہ کس کا کتنا حصہ ہے، اور کس کا نام پہلے ہے اور کس کا نام بعد میں ہے یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس جذبے کو جہاں تک ہو سکے مغلوب کرنا چاہیئے۔ اپنے اپنے مسلک پر پورے طور پر قائم رہنا چاہیئے جسے ہم حق سمجھتے ہوں اس کو حق سمجھنا چاہیئے۔ اس سے ہٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سودا کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن سب دعوت اسلامی کا محاذ اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کا محاذ بنائیں۔ اس ملک میں اسلامی زندگی پیدا ہو اور وہ آنکھوں سے دیکھی جا سکے اور یہ ملک دوسروں کے لئے نمونہ بنے۔

ایثار و قربانی:

تیسری بات یہ ہے کہ ہم جتنا بھی ہو سکے ایثار سے کام لیں اور باہمی نزاع سے پرہیز کریں۔ ہماری زندگی جتنی سادہ ہوگی، ہماری زندگی میں جتنی قربانی ہوگی اتنا ہی اثر پڑے گا۔ اتنا ہی بہتر نتیجہ نکلے گا۔ سب سے خطرناک بات آپس کی نزاع ہے۔ ہماری آپس کی دینی مباحث کا میدان اور ہے، اس کے کہنے کا موقع اور ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ اکبر اس لئے دین سے متنفر ہوا کہ اس نے علماء کو مرغوں کی طرح لڑتے دیکھا۔ اگر کوئی مسئلہ چھڑتا تو ان میں آپس میں اتنی تیز بحث ہوتی اور ہر ایک دوسرے پر اپنا تفوق اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کرتا جیسا کہ دنیا والے اور جاہ طلب کرتے ہیں۔ اکبر نے سوچا یہ کیسے لوگ ہیں، یہ ہمارے وزراء ارکان سلطنت اور خالص دنیا دار لوگ بھی اس سطح پر نہیں آتے۔ جب حضرت مجدد صاحبؒ کو یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر کا ارادہ ہے کہ وہ چند علماء کو اپنے دربار میں مشورہ کرنے کے لئے رکھے تو انہوں نے نواب سید فرید کو خط لکھا کہ خبردار خبردار! بادشاہ کو رائے دو کہ مخلص اور حقانی عالم صرف ایک آدمی کو رکھے۔ یہ مجدد صاحب کی فراستِ ایمانی تھی جو انہوں نے اس بات کو سمجھا۔ میں نہیں کہتا کہ ہر موقع اور مجلس میں صرف ایک ہی عالم رہے لیکن میں کہتا ہوں کہ علماء کے آپس کے نزاعات اور بحث اور نفی کرنے سے ایک دوسرے کی تذلیل کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔

خطرے کے اظہار کرنے کا بہرحال ہر شخص کو حق ہے۔ ایک بچہ بھی خطرہ کا اظہار کر سکتا ہے کہ یہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے چور نہ آ جائے۔ اس طرح یہ دو تین چیزیں آپ سے کہتا ہوں کہ ایک تو آپ جدید تعلیمیافتہ طبقہ کو یہ تاثر نہ لینے دیں کہ کتاب و سنت اور امت کی تشریحات میں فقہ کا اور اصول فقہ کا جو ذخیرہ ہے وہ موجودہ تمدن کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ موجودہ مسائل حل نہیں کر سکتا۔ یہ خیال بڑا خطرناک ہے۔ یہ الحاد تک پہنچا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ عمل سے عوام پر اور خواص پر جو حکومت میں ہیں یہ تاثر دیں کہ آپ کی سطح بلند ہے عوام کی سطح سے، آپ کی زندگی میں سادگی نظر آئے وہ دیکھیں کہ آپ تھوڑی چیز پر قناعت کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہ آپ چاہیں کہ آپ کی بڑی بڑی تنخواہیں ہوں اور گریڈ ہوں، اور جو تنخواہیں وزراء کو مل رہی ہیں اور ان کو جو فوائد اور مواقع حاصل ہیں وہ ہم کو بھی حاصل ہوں۔ ہماری کیڈلک کار ہو۔ ہمارے پاس بھی کوٹھی ہو اور وہ کسی وزیر کی کوٹھی سے کم نہ ہو بلکہ صاف صاف میں یہ کہوں گا کہ کوئی بوریہ نشین ہو تو زیادہ کام کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ طبقہ اسی کے سامنے جھکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی بے تکلف بوریہ نشین بنے۔ میں اس کی تعلیم نہیں دیتا۔ لیکن یہ واقعہ ہے یہ طبقہ اسی کے سامنے آ کر جھکتا ہے اور مانتا ہے جسکو سب سے زیادہ بے نیاز دیکھتا ہے۔ حضرت مجددؒ کے سامنے وقت کے شہنشاہ کیوں جھکے؟ اس لئے کہ یہ اللہ کا بندہ نہ کبھی کسی کی سفارش کرتا ہے اور نہ کبھی دربار میں آتا ہے۔ بیٹھا اللہ اللہ کرتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے مشورہ کرتا ہے۔ ہمارے تمام مشائخ نے یہی کیا۔ کبھی بادشاہوں کے قریب نہیں گئے مگر دور سے نگرانی کرتے رہے حکومت کو اچھے آدمی دیتے رہے لیکن وہ کہتے تھے کہ آگ کو دور سے تاپو تب تو ٹھیک ہے اگر ہاتھ ڈالو گے تو جل جاؤ گے۔ یہ چند باتیں ہیں جو میں نے مختلف موقعوں پر عرض کی ہیں۔ سب کا ماحصل یہی ہے کہ اسوقت بڑا امتحان ہے ہمارا، پھر عالم اسلام کا امتحان ہے ہمیں اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دینا چاہیئے کہیں ہماری صلاحیت کی کمی سے اسلام کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ کوئی نہ کہے اور لکھے کہ علماء کی عدم صلاحیت سے ہوا۔ میں اتنی باتیں

اللہ والوں کی دُنیا ـــــ حافظ ارشاد احمد دیوبندی

حبیب کبریا علیہ السلام کی صاحبزادیاں

یہ سابقہ مضمون" سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے فضائل اور عظیم الشان کارناموں کا تتمہ ہے۔ آپ کی دو بیویاں جو کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں تھیں

سیدہ بی بی زینبؓ

بی بی زینب رضی اللہ عنہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب صاحبزادیوں سے بڑی صاحبزادی ہیں۔

بی بی زینبؓ کی ان گنت فضیلتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس طرح حضرت نبی کریم علیہ السلام کی رسالت پر مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایمان لائے تھے اور عورتوں میں سب سے پہلے ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سعادتِ ایمان سے سرفراز ہوئیں، اسی طرح لڑکیوں میں سے سب سے پہلے حضرۃ سیدہ بی بی زینب رضی اللہ تعالیٰ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئیں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

سیدہ زینبؓ کے شوہر :

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بی بی زینبؓ کا نکاح آپ کے خالہ زاد بھائی جناب حضرت ابوالعاص اُموی رضی اللہ تعالیٰ سے کیا جو سیدہ خدیجہؓ کی حقیقی بہن ہالہ بنت خویلد کے لڑکے تھے۔ سیر الصحابہؓ کے مصنف لکھتے ہیں :

ابوالعاصؓ حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے۔ وہ انہیں بہت محبوب رکھتی تھیں اور اپنا لڑکا تصوّر کرتی تھیں (سیر الصحابہؓ)

حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ کا کاروبار بہت وسیع تھا اور ان کی دیانت داری بھی بہت ہی مشہور تھی (سیر الصحابہؓ) اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح الامین کے لقب سے مشہور تھے۔

بہادری کا یہ عالم تھا کہ اہل عرب سے (جروالبطحا) یعنی شیر حجاز کا خطاب حاصل کیا (اصابہ) اور جب قریش مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شعب بن ہاشم میں بند کر دیا تو انتہائی دُلیری کا ثبوت دیتے ہوئے کفار کی سخت مخالفت کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے پینے اور خرچ کا انتظام کرتے رہے جس پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا :

ابوالعاصؓ نے ہماری دامادی کا حق ادا کر دیا۔

(ناسخ التاریخ مؤلفہ شیعہ)

حضرت ابوالعاصؓ اموی اور سیدہ زینبؓ سے دو جنتی بچوں کا ظہور ہوا۔ ایک لڑکا جس کا نام "علی زینبیؓ" تھا اور ایک لڑکی جس کا نام حضرت "امامہؓ" تھا۔

سیدنا علی زینبیؓ :

یہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے اور محبوب حقیقی نواسے ہیں۔ عربی ماحول کے مطابق رضاعت کی مدت دو سال آپ نے "قبیلہ بنی غاضرہ" میں گذارے۔ اس کے بعد بچپن سے جوانی تک اپنے پیارے اور محبوب نانا حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش میں پلے بڑھے اور تربیت پائی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیاری بیٹی سے یہ بچہ خود مانگ لیا تھا (اصابہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس سب سے بڑے نواسے حضرت علی زینبیؓ سے بہت محبت تھی اور ہر اہم موقع پر آنحضرت علیہ السلام اس کو ہر حالت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ چنانچہ فتح مکہ کے عظیم ترین مبارک موقع پر بھی حضرت علی زینبیؓ آپ کے ہمراہ تھے بلکہ خود آپ کی

اونٹنی پر سوار تھے (رحمۃ للعالمین) اور اپنے

اس وقت حضرت علی زینبی رضؓ کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی (اصابہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب اور بڑے نواسے نے تاریخ عالم کا رخ پلٹ دینے والی عظیم الشان جنگ "یرموک" میں جام شہادت نوش فرمایا اور اللہ تعالٰے کی راہ میں کلمۂ اسلام بلند کرنے کی خاطر جہاد کرتے ہوئے دونوں جہانوں کا تاج سر پر سجا کر ۱۵ھ میں اپنے رب سے واصل ہو گئے رضی اللہ تعالٰے عنہ (تاریخ ابن عساکر) اس جنگ یرموک کا نقشہ حضرت علامہ اقبال مرحوم نے بھی اپنے اشعار میں پیش کیا ہے ۔

سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا:

جیسا کہ آپ کو علم ہے یہ حضرت علی زینبی رضؓ کی بہن ہے ۔ اس کے ساتھ بھی حضرت نبی کریم علیہ السلام کو بڑی محبت تھی ۔ چنانچہ بچپن میں جب یہ پاک و معصوم بچی کھیلتے کھیلتے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی کمر مبارک پر سوار ہو جاتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک سجدہ میں ہی رہتے جب تک یہ معصوم پاک اولوالعزم بچی خود نہ اتر جاتی ۔ (بخاری و مسلم) ۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تحفے کے طور پر ایک عمدہ ہار آیا تو آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ ہار میں اپنے عزیزوں میں سے سب سے زیادہ محبوب کو پہناؤں گا ۔ لوگوں کو گمان تھا کہ شاید یہ ہار حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم عنایت فرمائیں گے اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ زیادہ محبوب تھیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس سے بڑوں کی بجائے بچوں سے تھی اور وہ ہار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بی بی سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا کو پہنایا ۔ سیدہ فاطمہ رضؓ کے انتقال کے بعد خود سیدہ فاطمہ رضؓ کی وصیت کے مطابق حضرت علی المرتضیٰ نے حضرت سیدہ امامہ رضؓ ہی سے نکاح کیا تھا ۔

(رحمۃ للعالمین)

سیدہ زینب رضؓ کی وفات:

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے ۸ھ میں وفات پائی اور آپ رضؓ کے شوہر سیدنا ابوالعاص رضؓ اموی نے وفاداری کا حق اس طرح ادا فرمایا کہ آپ رضؓ کے بعد کسی اور عورت کے ساتھ نکاح نہ کیا ۔ آپ جتنا عرصہ زندہ رہے کوئی شادی نہیں کی اور خلافت صدیقی کی مشہور جنگ یمامہ میں اسلام کے باغی مرتدین سے مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا اور جنت الفردوس میں اپنی محبوب رفیقۂ حیات رضی اللہ عنہا اور حضرت خسر صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور جا پہنچے ۔ رضی اللہ تعالٰے عنہما ۔

سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا:

درمنثور میں ہے کہ کانت ذات جمال بارع یعنی وہ نہایت حسین و جمیل خاتون تھیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن کے صاحبزادے سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے کیا ۔ (سیدنا عثمان رضؓ کی نانی "ام بیضاء" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کی سگی مائی جائی بہن تھیں) ۔ ان دونوں میاں بیوی میں بہت محبت تھی یہاں تک کہ قریش میں بطور مثل یہ مقولہ مشہور تھا " احسن الزوجین راهما الانسان رقیۃ و عثمان رضؓ ۔ میاں بیوی کا سب سے اچھا جوڑا لوگوں نے جو دیکھا وہ رقیہ رضؓ اور عثمان رضؓ کا ہے (صحابیات) از نیاز فتح پوری

عبداللہ بن عثمان رضؓ

حضرت رقیہ رضؓ سے حضرت عثمان رضؓ کا ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ رکھا گیا ۔ اس لئے حضرت عثمان رضؓ کی کنیت بھی ابو عبداللہ یعنی اپنے اسی صاحبزادے کے نام پر تھی ۔

وفات:

حضرت بی بی رقیہ رضؓ کو ۲ھ میں چیچک نکلی اور آپ رضؓ اسی چیچک کے مرض میں انتقال فرما گئیں ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

(رحمۃ للعالمین)

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملنے سے ۵ سال قبل جب بیت اللہ کی از سر نو تعمیر ہو رہی تھی آپ رضؓ پیدا ہوئیں ۔ (سیرۃ النبی) ہجرت نبوی کے پانچ مہینے بعد مدینہ منورہ میں رسول کریم علیہ السلام کے چچا زاد بھائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے آپ رضؓ کا نکاح ہوا اور بدر فتح ہونے کے بعد ۲ھ میں رخصتی ہوئی ۔

حضرت علی رضؓ و فاطمہ رضؓ کی ازدواجی زندگی:

حضرت علی رضؓ اور حضرت بی بی فاطمہ رضؓ میں جب کبھی خانگی معاملہ میں رنجش ہو جاتی تو حضرت نبی کریم علیہ السلام ہمیشہ ہی ان میاں رضؓ بیوی رضؓ میں مصالحت کی کوشش فرمایا کرتے تھے ۔ (صحابیات از نیاز فتح پوری) ایک مرتبہ حضرت علی شیر علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے کچھ ایسا برتاؤ ہوا جو بی بی فاطمہ رضؓ کو ناگوار ہوا اور آپ رضؓ حضرت اباجان صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں گئیں ۔ آپ کے پیچھے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حاضر خدمت ہوئے حضرت فاطمہ رضؓ نے حضرت علی رضؓ کے غصہ کی شکایت کی ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اے بیٹی جو کچھ میں کہوں اسے غور و فکر سے سنو اور عمل کرو ۔ وہ کون سے مرد و عورت ہیں جن کے درمیان کبھی کوئی رنجش واقع نہ ہوئی ہو اور یہ کیا ضروری ہے کہ مرد تمام کام عورت کے عین منشاء کے مطابق ہی کرے اور اپنی بیوی سے کچھ

نہ کہے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اس مصلحانہ گفتگو کا اثر اس قدر گہرا ہوا کہ پھر انہوں نے ایسی کوئی بات نہ کی جس سے حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا رنجیدہ خاطر ہوتیں۔ حضرت علی المرتضیٰ رضؓ نے بی بی صاحبہؓ سے زبانی طور پر کہہ دیا کہ آئندہ کسی صورت آپؓ کو شکایت کا موقع نہ ملے گا۔ (صحابیات) بی بی فاطمہؓ کو اپنی دوسری بہنوں سے بے حد محبت تھی جس کی وجہ سے آپؓ نے اپنی تینوں صاحبزادیوں کے نام اپنی بہنوں کے نام پر ام کلثومؓ، زینبؓ اور رقیہؓ رکھے۔ یہی وہ ام کلثومؓ بنت فاطمہؓ ہیں جنکا نکاح خود حضرت علیؓ نے حضرت عمر فاروقؓ سے کیا تھا)۔

وفات:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چھ ماہ بعد حضرت بی بی فاطمہؓ نے انتقال فرمایا اور جنت الفردوس میں اپنے والد ماجد علیہ السلام اور بہنوں سے جا ملیں۔

سیدنا حضرت امام حسنؓ:

آپؓ حضرت نبی کریم علیہ السلام کے تیسرے نواسے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ فرمایا کرتے تھے کہ بابی شبیہ النبی لیس شبیہا بعلی کہ حسنؓ اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہیں اپنے باپؓ کے مشابہ نہیں ہیں (بخاری شریف)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس تیسرے نواسے حضرت حسنؓ سے بھی بہت محبت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ان ابنی ھذا سید ولعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین۔

کہ یقیناً میرا یہ نواسہ بڑا مدبر بنے گا اور ممکن ہے اللہ تعالیٰ اسی کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرا دے (بخاری شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی حرف بحرف صحیح ہوئی اور حضرت علی المرتضیٰ کی شہادت کے بعد سیدنا حضرت حسنؓ نے سیدنا حضرت معاویہؓ کی دعوت صلح پر لبیک کہتے ہوئے امت کو خانہ جنگی سے بچا لیا۔ (بخاری شریف)۔

بہر حال سیدنا حضرت حسنؓ نے اپنے خالو سیدنا حضرت عثمان غنیؓ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے مفسدین کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا اور بہادری کے ساتھ اپنے صلح کے موقف پر قائم رہے۔ شیعہ حضرات کی کتب میں بھی یہ واقعات منقول ہیں اور حضرت حسنؓ کے اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے شیعہ مصنفین نے درج کیا ہے۔

سیدنا حضرت امام حسینؓ:

آپؓ حضرت نبی کریم علیہ السلام کے چوتھے اور سب سے چھوٹے نواسے ہیں۔ ویسے حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی عمر میں بہت ہی کم تفاوت ہے۔ آپؓ پانچ چھ برس کے تھے کہ حضرت نبی کریم علیہ السلام نے عالم کائنات کو داغ مفارقت دے کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ چونکہ حضرت صدیق اکبرؓ یا فاروق اعظمؓ کے دور خلافت میں آپ کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی اس لئے کوئی کارنامے انجام دینا ناممکن تھا۔ ہاں حضرت خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں آپ جوان تھے۔ اس لئے اس دور میں آپؓ نے جنگوں میں حصہ لیا، خصوصاً ایران کی شہنشاہیت کو ختم کرنے کے لئے آپ کے نمایاں کارنامے صحیح تاریخی کتب میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔

شہادت:

خلیفۂ راشد حضرت امیر المومنین امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد بعض فتنہ پرداز اور مکار کوفیوں نے آپ کو عراق بلانے کے لئے خطوط لکھ کر آپ کو طلب کیا اور جب آپؓ تشریف لے گئے تو ان کوفیوں نے دھوکہ دیا اور آپؓ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ حتیٰ کہ وہی خطوط لکھنے والے دھوکہ باز کوفیوں نے آپ کو وادی طف میں جو کربلا کے نام سے مشہور ہے شہید کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رضی اللہ عنہ

سیدہ ام کلثومؓ:

سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی اور سب بہنوں سے چھوٹی صاحبزادی ہیں (جوامع السیر) چونکہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بڑی صاحبزادیوں کے عقد نکاح سے فارغ ہو چکے تھے۔ سیدہ فاطمہؓ کا بھی حضرت علی المرتضیٰ رضؓ سے نکاح ہو چکا تھا۔ اس لئے اب آنحضرت علیہ السلام کی چاروں صاحبزادیوں میں صرف سب سے چھوٹی صاحبزادی سیدہ ام کلثومؓ غیر شادی شدہ رہ گئی تھیں۔ چونکہ سیدہ رقیہؓ چیچک کے مرض میں وفات پا گئی تھیں اور حضرت عثمان غنیؓ نے سیدہ رقیہؓ کو بہت عزت و محبت سے رکھا تھا اس لئے آنحضرت علیہ السلام نے سیدہ ام کلثومؓ کو بھی انہیں کی زوجیت میں دینا مناسب تصور فرمایا اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس نکاح کی اجازت مل گئی تو آنحضرت علیہ السلام نے حضرت عثمان غنیؓ کو بلا کر فرمایا:

یہ جبریل علیہ السلام ہیں جو خدائے بزرگ کا حکم سنا رہے ہیں کہ میں اپنی دوسری بیٹی حضرت ام کلثومؓ بھی تم سے بیاہ دوں۔ (رحمۃ للعالمین)

اس طرح حضرت عثمان غنیؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادی کی زوجیت کا شرف حاصل ہو گیا۔ اس لئے آپ کا لقب "ذی النورین" یعنی دو نور والا ہو گیا اس لئے کہ یہ وہ سعادت ہے جو سیدنا حضرت عثمانؓ کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔ حضرت عثمانؓ نے سیدہ ام کلثومؓ کو بھی اسی طرح خوش رکھا جیسے سیدہ رقیہؓ کو خوش رکھا تھا اور جب ایسا محبت کرنے والا شوہر ہو تو کون خاتون ہے جو اس کا دم نہ بھرے۔ یہی حالت سیدہ ام کلثومؓ کی تھی

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میری اور دس بیٹیاں بھی ہوتیں تو یکے بعد دیگرے میں سب کی سب حضرت عثمان رضی کے عقد نکاح میں دیدیتا۔ سبحان اللہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔
(صحابیات (ص ۱۳۱)

وفات :

سیدہ رقیہ رضی نے جب انتقال فرمایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی بن مالک سے روایت ہے کہ سیدہ ام کلثوم رضی کی وفات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قبر پر مغموم بیٹھے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔
(رحمۃ للعالمین)

آنحضرت علیہ السلام کی حضرت عثمان رضی سے محبت :

طبقات ابن سعد میں ہے کہ سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد رسول اکرم

تاج المحدثین

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری

مقبول جہانگیر

سہارنپور کی مردم خیز سرزمین سے جنوب کی طرف کوئی سولہ سترہ میل کے فاصلے پر ایک بستی انبہٹہ ہے۔ یہ بستی ۷۷۴ھ میں فیروز شاہ تغلق کے سپہ سالار سعد اللہ بیگ نے بسائی، اور یہاں صدیقی، فاروقی اور ایوبی شیوخ بڑی تعداد میں آباد ہوئے۔ ۱۱۰۰ھ میں امام وقت حضرت شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ نے اسے اپنا وطن بنایا، چنانچہ بستی کا نام انبہٹہ پیرزادگان ہو گیا۔

یہی انبہٹہ پیرزادگان' حضرت مولانا خلیل احمد مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا وطن ہے۔ قصبہ گنگوہ یہاں سے پانچ کوس ہے جہاں جلیل القدر ولی اللہ حضرت شیخ عبدالقدوس آرام فرما رہے ہیں۔ مولانا خلیل احمد کا جدی سلسلۂ نسب چونتیسویں صدی میں حضرت ابو ایوب خالد انصاری رضؓ سے مل جاتا ہے جن کا گھر مہاجر مہتابِ رسالت کا مدینے میں سب سے پہلی قیام گاہ بنا۔ مولانا خلیل احمد کے والد کا اسم گرامی شاہ مجید علی تھا۔ مولانا ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ ماجدہ استاذ العلماء مولانا مملوک علی نانوتوی کی حقیقی بیٹی اور مولانا یعقوب نانوتوی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کی ہمشیرہ تھیں۔ مولانا مملوک علی صاحب مشاہیر ہند میں سے ہیں اور ان کے تلامذہ میں سرسید احمد خاں، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن کے والد مولانا ذوالفقار علی، علامہ شبیر احمد عثمانی کے والد مولانا فضل الرحمٰن، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولوی کریم الدین پانی پتی صاحب "طبقات شعرائے ہند"، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور مولانا شیخ محمد تھانوی ایسی بڑی بڑی ہستیاں شامل ہیں۔

مولانا خلیل احمد انہی مملوک علی کے نواسے تھے اور یہ کہنا لاحاصل ہے کہ انہوں نے علم و فضل سے بھرپور خانوادے میں شعور کی آنکھیں کھولیں۔ آپ کے والد ماجد شاہ مجید علی چونکہ ریاست میں ملازم تھے اور سفر کی وہ سہولتیں مہیا نہ تھیں، جو اس زمانے میں عام ہیں' اس لئے مہینوں، برسوں میں وطن میں آنا نصیب ہوتا۔ اسی وجہ سے مولانا خلیل احمد کی رضاعت اور تربیت زیادہ تر آپ کے نانا مملوک علی اور ماموں مولانا یعقوب کے پاس ہوئی۔ خلیل احمد پانچ برس کے ہوئے تو آپ کو مکتب میں بٹھانے کا ارادہ کیا گیا۔ خود آپ کے نانا نے تبرکاً بسم اللہ پڑھا کر قاعدہ شروع کرا دیا۔ فطری طور پر آپ ذہین اور ذکی تھے' اس لئے بہت جلد ناظرہ قرآن ختم کر لیا۔ اس کے بعد اردو کی تعلیم شروع ہوئی۔ انہی ایام میں ۵۷ء کا سانحہ پیش آیا۔ اردو کے ساتھ ساتھ آپ نے فارسی میں بوستانِ سعدی بھی ختم کر لی تھی۔ انہی دنوں آپ کے چچا مولوی انصار علی وطن تشریف لائے۔ وہ ریاست گوالیار میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ بھتیجے کا شوقِ تعلیم دیکھا تو واپسی میں اسے اپنے ساتھ لے گئے تاکہ خود عربی اور دینیات پڑھائیں۔

گوالیار میں آپ نے میزان الصرف پڑھی۔ پھر تھوڑے ہی عرصے میں صرفِ میر اور پنج گنج بھی ختم کر ڈالی۔ گیارہ برس کی عمر تھی کہ والد ماجد شاہ مجید علی ملازمت ترک کر کے وطن آ گئے اور آپ کو گوالیار سے بلا لیا۔ یہاں آپ کی تعلیم مولوی سخاوت علی صاحب کے سپرد ہوئی جو قصبے کے مشہور استاد اور محترم عالم تھے۔ آپ نے ان سے کافیہ تک پڑھا۔ پھر بعض عزیزوں کے مشورے سے آپ کو قصبے کے انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔

اگرچہ بڑوں کے حکم کی تعمیل میں آپ نے انگریزی شروع کر دی تھی، مگر دل اچاٹ تھا اور وہ قلب' جو علوم عربیہ کا لذت آشنا ہو چکا تھا، خواہشمند تھا کہ کاش علوم دین کی تعلیم کا کوئی بہتر انتظام ہو جائے اور یہاں سے چھٹکارا نصیب ہو۔ دفعتاً محرم ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کے قائم ہونے کی خبر آپ نے سنی اور معلوم ہوا کہ صدر مدرس آپ کے ماموں مولانا محمد یعقوب ہیں، لہٰذا آپ نے والدین سے کہا کہ دیوبند بھجوا دیا جائے۔ والدین نے بیٹے کی خواہش پوری کی اور انگریزی مدرسے کو خیرباد کہہ کر دیوبند آ گئے۔ دارالعلوم دیوبند سے چھ ماہ بعد ہی سہارنپور میں مدرسہ مظاہر العلوم کا افتتاح ہوا اور یہاں مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی صدر مدرس بنے۔ وہ بھی رشتے میں خلیل احمد کے ماموں تھے۔ یکایک دیوبند سے خلیل احمد کا دل گھبرایا اور آپ سہارنپور چلے آئے اور ہمہ تن تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے اکثر کتابیں خصوصاً حدیث، فقہ، اصول اور تفسیر مولانا مظہر سے پڑھیں اور باقی کتابیں بالخصوص منطق، فلسفہ، ہئیت اور ریاضی مدرسے کے دیگر استادوں سے ۱۲۸۸ھ میں جبکہ آپ کی عمر انیس برس کی تھی،

درسِ نظامیہ ختم کرلیا اور پانچ سال میں مدرسے سے سندِ فراغ حاصل کی۔ اس کے بعد علوم ادبیہ میں مہارت کا شوق آپ کو پنجاب کی طرف کھینچنے لگا کہ ہندوستان کے مشہور ادیب مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری اس وقت اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر اور علوم شرقیہ کے استاذ اعظم تھے۔ طالب علم دُور دُور سے آکر مولانا سے فیض اٹھا رہے تھے۔ آپ نے ان سے علوم ادبیہ کی خاطر خواہ تکمیل کی۔

لاہور سے سہارنپور واپس پہنچ کر آپ نے مظاہر علوم میں تدریس کا کام شروع کیا۔ چار روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ رمضان کے مہینے مدرسے میں تعطیل رہتی اور آپ وطن تشریف لے جاتے۔ وطن میں قرآن مجید کے حفاظ کی کمی تھی بالخصوص شرفا میں کہ حفظِ قرآن کا شوق کبھی نہیں رہا تھا۔ اس لئے آپ اور آپ کے چچازاد بھائی صدیق احمد محلے سے دُور ایک مسجد میں تراویح کے لئے جایا کرتے تھے۔ اس مسجد میں حافظ رحیم بخش نور باف قرآن سناتے تھے۔ ایک سال یہ دونوں اور ان کے ایک عزیز مولوی اسحٰق کہ وہ بھی طالب علم تھے، ان حافظ رحیم بخش صاحب کے پاس گئے اور درخواست کی کہ امسال ہماری مسجد میں قرآن سُنا دیجئے کہ جو لوگ ضعف کے سبب یہاں نہیں آسکتے، وہ بھی اس نعمت سے بہرہ ور ہو جائیں۔

حافظ صاحب نے انکار کیا۔ ان تینوں نے اصرار۔ آخر حافظ رحیم بخش نے تیز لہجے میں کہا، "اگر قرآن سننے کا اتنا ہی شوق ہے تو خود حفظ کیوں نہیں کرلیتے؟ حدیث پڑھ لیتے ہو قرآن یاد نہیں ہوتا۔"

ان کا یہ کہنا مولانا خلیل احمد پر بہت شاق گزرا۔ حافظ صاحب سے تو احترام کے سبب کچھ نہ کہا مگر بعد میں تینوں دوستوں نے مشورہ کیا کہ یہ رمضان تو جیسا ہو سکے گزار لو اور آئندہ سال تینوں دوست دس دس پارے حفظ کر کے وطن آئیں۔ ایک شروع کے دس، دوسرا درمیان کے دس اور تیسرا آخری دس۔ پھر اپنے محلے کی مسجد میں تراویح ہو تاکہ کسی کے محتاج نہ رہیں۔

غرض یہ ارادہ کر کے تینوں رمضان کے بعد اپنے اپنے مدرسے میں چلے گئے۔ درس و تدریس سے جو وقت بچتا، اس میں قرآن مجید حفظ کرتے۔ ہر چند کہ مولانا خلیل احمد کا ارادہ دس پارے کا تھا مگر جب سلسلہ چل پڑا، تو طبع ہمت پسند رُکی نہیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب آپ رمضان میں واپس آئے تو پورے قرآن مجید کے حافظ بن کر آئے۔

اس کے بعد آپ نے اس نعمت عظیمہ کی محافظت کا اس درجہ اہتمام فرمایا کہ گرمی ہو یا سردی، عسر ہو یا یسر کسی حال میں کوئی دن اس کی تلاوت سے خالی نہیں رکھا۔ آپ نے پورے قرآن مجید کا ختم اپنی نماز کا جزو بنالیا۔ کم از کم سوا پارہ ورنہ دو اڑھائی پارے بعد مغرب صلوٰۃ الاوابین کی چھ رکعت میں پڑھا کرتے اور یہ رکعتیں سفر اور مرض میں بھی قضا نہ ہوتی تھیں اسی طرح تہجد کے بارہ نفلوں میں دوسرا ختم معمول تھا کہ دو پاروں سے لے کر چار پارے تک تلاوت فرماتے۔ جوانی سے لے کر بڑھاپے تک یہی طریق رہا اور کبھی اس میں فرق نہ آیا۔ آخر عمر میں جبکہ بدن ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا تب بھی عزیمت کی مجسم تصویر تھے۔ آپ کی جوان لڑکی ہانی ٹپ دق میں مبتلا ہوئی۔ زندگی کی آخری رات آئی تو باپ سے خواہش کی کہ ابا آج شب میرے پاس بیٹھ کر گزاریں کہ آپ کا چہرہ دیکھتی ہوئی رخصت ہو جاؤں۔ مولانا کو اپنی اس بیٹی سے محبت بھی بڑی تھی اور کئی راتیں اس کی تیمارداری میں آنکھوں میں کاٹ چکے تھے، تاہم ماں باپ دونوں اس کے پاس بیٹھ گئے۔ نصف شب گزری تھی کہ سانس میں تغیر پیدا ہوگیا اور سکرات شروع ہوئی۔ رات کا سناٹا تھا اور مولانا کے لئے یہ جاں گداز نظارہ۔ یٰسین شریف پڑھتے تھے اور بیٹی پر دم کرتے جاتے تھے۔ اس حسرت ناک منظر میں وہ وقت بھی آیا جس میں آپ معمول کے مطابق اپنے مولیٰ کے سامنے حاضری دیتے اور تلاوت قرآن کیا کرتے تھے۔ اس لئے اہلیہ سے کہا: "تم ذرا ہانی کے سانس دیکھتی رہو میں چند نفلیں پڑھ لوں۔" یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور وضو کر کے اپنے شغل میں لگ گئے جس کے گذشتہ پچاس برس سے عادی تھے۔ ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے اور بیوی سے پوچھتے کہ کیا حال ہے؟ جب یہ جواب سنتے کہ ابھی سانس باقی ہیں، تو پھر نیت باندھ لیتے اور تلاوت شروع کر دیتے۔ آخر ادھر آپ کا معمول ختم ہوا اُدھر بیٹی کے سانس ختم ہونے کو۔ سلام پھیرنے پر آپ نے پوچھا: کیا حال ہے؟ جواب ملا رخصت ہوئی۔ آپ نے اِنّا لِلّٰہ کہا اور جنازے کے سرہانے آن بیٹھے۔ بیوی سے کہا: ابھی تو وقت باقی ہے، نفلیں پڑھتا ہوں تو پڑھ لو۔

صرف تلاوتِ قرآن ہی نہیں، ہر امر مستحب و مسنون میں آپ کا یہ اہتمام تھا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔ اس استقامت پر ہزارہا حسی کرامات قربان کہ اسی کو اہل دل نے فوق الکرامت لکھا ہے۔ مولانا عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ میں نے کٹھن سفر یعنی مدینہ منورہ کے راستے میں حضرت کو ایسا شدید بخار چڑھا ہوا دیکھا کہ بدن پر ہاتھ رکھنا مشکل تھا، مگر نماز با جماعت تو کیا قضا ہوتی، رات میں ذرا خنکی آتی، بخار ہلکا ہوتا اور حضرت آخر شب میں اپنا معمول پورا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ محافظت کلام اللہ کا یہ معمول تو گیارہ مہینوں کے لئے تھا، مگر جب رمضان المبارک کا چاند نظر آجاتا، تب آپ کی جدوجہد اور ذوق شوق کی انتہا نہ رہتی۔ اس ماہ مبارک میں تلاوت کا نصاب دو چند اور سہ چند ہو جاتا۔ کبھی حفظ پڑھتے کبھی دیکھ کر۔ ایک مرتبہ فرمایا: ضعف کی وجہ سے حافظے پر اثر پاتا ہوں، اس لئے ڈر ہے کہیں کلام مجید نہ بھول جاؤں، اس وجہ سے ایسا اہتمام کرتا ہوں۔" پھر ارشاد ہوا، دماغ چاہے جائے یا رہے، مگر کلام مجید تو نہیں چھوٹتا۔

باوجودیکہ آپ درس نظامیہ کے تمام علوم سے فارغ ہو چکے اور مسندِ درس پر بیٹھ چکے تھے، مگر فطرتِ سلیم مغز کے روغن اور بدن کی روح یعنی اس معرفت الٰہیہ کی جویا تھی جو قال کو حال بنادے اور اس آبِ حیات کی پیاسی تھی جو کشتِ زارِ ایمان کی آبیاری کرے اور اعمالِ جوارح

کے ایک ایک دانے کو ستر ستر ہزار بنا کر نکالے۔ یہ طلب اتنی بڑھی کہ راہبر کی تلاش میں آپ کا طائر خیال بار بار پرواز کرتا اور بے چینی کے ساتھ اس کا داعیہ پیدا ہوتا کہ جلد کسی اللہ والے کا دامن پکڑوں جو علم ظاہر کے مقصود تک پہنچائے اور طاعت و بندگی کا ذوق پیدا کرے۔ یہ مقصود حاصل کرنے کے لئے اس دور میں مولانا رشید احمد گنگوہی سے بہتر کون تھا کہ قطب الارشاد تھے اور اہل علم و بصیرت کی جماعتیں دور دور سے آپ کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں، چنانچہ آپ نے اپنے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب کو کہ حضرت گنگوہی کے استاذ زادے تھے، اس مقصود کا واسطہ بنایا۔ مولانا یعقوب نے حضرت گنگوہی کے نام خط لکھ کر اپنے بھانجے کے پاس بھیج دیا اور آپ وہ خط لے کر گنگوہ حاضر ہوئے۔ حضرت گنگوہی نے اپنے استاذ زادے کا خط پڑھ کر اس طرح رکھ دیا گویا کوئی چیز ہی نہیں اور استغنا کے ساتھ فرمایا میاں تم خود پیرزادے ہو، پیر ہو، تمہیں کسی کا مرید ہونے کی کیا ضرورت؟

مولانا خلیل احمد یہ سنتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور عرض کیا: حضرت کیسی پیرزادگی! میں تو اس دربار کے کتوں کے برابر بھی نہیں۔ بیعت کا حاجتمند ہی نہیں، سراپا احتیاج ہوں۔ چھاتی سے لگائیے یا دھکے دیجئے میں تو حضرت کا غلام بن چکا۔

یہ الفاظ حضرت کی زبان سے نکلے تھے کہ حضرت گنگوہی کے چہرے پر انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ فرمایا بس بس بہت اچھا۔ اس کے بعد فوراً بیعت کر لیا۔ اور آپ یہ عہد کئے ہوئے گنگوہ سے رخصت ہوئے کہ حضرت نے جو کچھ حکم دیا اس پر مرمٹوں گا اور جان کھپا دوں گا کہ طلب کا منتہا یہی ہے۔

۱۲۹۷ھ میں جب آپ دوسرے حج کے لئے مکہ معظمہ روانہ ہوئے، تو حضرت گنگوہی نے مرشد العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں لکھا کہ مولوی خلیل احمد حاضر خدمت ہوتے ہیں۔ حضرت ان کی حالت پر مطلع ہو کر مسرور ہوں گے۔ چنانچہ جب آپ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو وہ آپ کی باطنی حالت دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور جب آپ رخصت ہونے لگے تو آپ کو سینے سے لگایا اور اپنی دستار مبارک اتار کر آپ کے سر پر رکھ دی۔ پھر مولانا رشید احمد گنگوہی کے نام مبارکباد کا خط لکھا اور آپ کو خلافت نامہ اپنی مُہر لگا کر عطا فرمایا۔ آپ نے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کا یہ عطیہ نہایت احترام سے قبول کیا اور دستار کو اسی بندش پر جو حاجی صاحب کی باندھی ہوئی تھی جگہ جگہ سے سی لیا کہ اس کے بل جدا نہ ہونے پائیں۔ بعد ازاں جب آپ حج کے تمام فرائض ادا کر کے سرزمین عرب سے گنگوہ واپس آئے تو حضرت حاجی امداد اللہ کا خط پیش کر کے دستار اور خلافت نامہ بھی اپنے مرشد کے سامنے رکھ دیا۔ مولانا گنگوہی نے فرمایا: "مبارک ہو، یہ تو اعلیٰ حضرت کا عطیہ ہے۔"

آپ نے عرض کیا: بندہ تو اس لائق نہیں، یہ آپ کی کرم نوازی ہے اور میرے لئے تو وہی مبارک ہے جو حضور کی طرف سے عطا ہو۔ حضرت قبلہ حاجی صاحب کا اجازت نامہ درحقیقت شہادت ہے کسی مسلمان کے ایمان کی؛ لہٰذا دو مقبول شہادتیں ثبت ہوں گی، تو قیامت کے روز بارگاہِ الٰہی میں پیش کر سکوں گا۔"

مولانا گنگوہی اس حسنِ ادب سے کہ اصل کمال یہی ہے، نہایت خوش ہوئے اور خلافت نامے پر دستخط فرما کر دستار سمیت آپ کے حوالے کر دیا۔ مگر ادب دیکھئے کہ جب تک مولانا گنگوہی حیات رہے، مولانا خلیل احمد نے کسی طالب علم کو بیعت کرنا پسند نہ فرمایا اور کسی نے اصرار بھی کیا تو آپ نے توبہ کرانے کے بعد اس سے یہ الفاظ کہلوائے کہ:

کہو بیعت کرتا ہوں میں حضرت
مولانا رشید احمد صاحب سے
خلیل احمد کے ہاتھ پر۔

البتہ حضرت گنگوہی کی وفات کے بعد آپ کا سلسلہ بڑھا اور اطرافِ ہند سے آگے نکل کر حجاز تک پہنچا کہ اہلِ حرمین شریفین نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

۱۲۹۳ھ میں مولانا خلیل احمد اپنے مرشد حضرت گنگوہی کی اجازت سے ریاست بھوپال چلے گئے۔ سکندر جہاں بیگم والیۂ ریاست کے شوہر جمال الدین، مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے اور ریاست میں انہوں نے ایک دینی مدرسہ جاری کیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنے استاد زادے مولانا محمد یعقوب کو تین سو روپے ماہوار پر ریاست میں بلا کر حق خادمیت ادا کریں، لیکن مولانا یعقوب اس وقت اکابر ملت کی تجویز سے دارالعلوم دیوبند میں تیس روپے ماہوار پر مدرس اوّل ہو چکے اور اجمیر کی یک صد روپے ماہانہ کی ملازمت اور بریلی کی انسپکٹری مدارس کو خیرباد کہ کر دارالعلوم دیوبند کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف فرما چکے تھے، اس لئے آپ نے بھوپال جانے سے انکار کر دیا۔ جمال الدین صاحب کو مولانا کے انکار سے مایوسی تو ہوئی لیکن پھر درخواست کی کہ آپ اگر تشریف نہیں لا سکتے تو کسی ہونہار عالم کو یہاں بھیج دیں۔ تب مولانا یعقوب نے اپنے بھانجے کا انتخاب فرمایا اور مولانا خلیل احمد نے اپنے مرشد سے اجازت لے کر پچاس روپے ماہوار پر بھوپال کا سفر اختیار کیا۔ اگرچہ بھوپال میں آپ کو کوئی تکلیف نہ تھی اور ہر طرح کی عزت، احترام اور آسائشیں میسر تھیں، لیکن مظاہر العلوم سہارنپور کے انوار و تجلیات وہاں نہ تھے۔ اس کے علاوہ بھوپال کی آب و ہوا موافق نہ آئی اور صحت خراب رہنے لگی اور آپ نے خواہش کی کہ وہاں سے مستعفی ہو کر وطن واپس آجائیں۔ مرشد گنگوہی کو سب حالات سے آگاہ کیا، وہاں سے جواب آیا: چونکہ معاش کا قضیہ نازک ہے، لہٰذا جب تک دوسری جگہ سامان نہ ہو جائے ترک مناسب نہیں۔ میں دوسری جگہ کی تدبیر کرتا ہوں۔ تجویز ہو کر مطلع کروں گا۔

اس حکم کی تعمیل میں مولانا خلیل احمد بھوپال ہی میں رُکے رہے یہاں تک کہ حج کے

دن قریب آ گئے اور آپ کو اطلاع ملی کہ نواحِ وطن کے بعض افراد حج کے لئے جا رہے ہیں۔ ہر چند کہ آپ غیر مستطیع تھے اور آپ پر حج فرض نہ تھا لیکن صفا کیش دل میں زیارتِ بیت اللہ و بیت الرسول کا فطری طور پر شوق رکھتے تھے اور مشتاقانِ سفرِ عرب کی خبر سن کر اس میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ اسی لئے آپ کا جی مچلنے لگا کاش امسال مجھے بھی حج نصیب ہو اور کسی طرح میں بھی حرمین شریفین کی حاضری سے بہرہ یاب ہو جاؤں۔ چنانچہ آپ نے پہلے مرشد گنگوہی کو عریضہ لکھا اور پھر مولانا جمال الدین مدار المہام ریاست بھوپال سے درخواست کی کہ ریاست کا طریق عمل یہ ہے کہ جو ملازم حج کو جائے اس کو رخصت بلا وضع اور ان چند ماہ سفر کی تنخواہ پیشگی دے دی جاتی ہے لہٰذا آپ بھی عنایت فرمائیں کہ میں حج کر آؤں۔ یہ درخواست جزوی طور پر منظور ہوئی اور آپ ناکافی روپیہ لے کر وطن آئے۔ دیکھا کہ جانے والے حجاج تو جا چکے مگر آپ بالکل ہراساں نہ ہوئے اور تنہا ہی روانہ ہو گئے۔ بمبئی پہنچے تو سب احباب پہلے ہی جہاز میں روانہ ہو چکے تھے چنانچہ بحری سفر اکیلے ہی کرنا پڑا۔ اس پہلے سفرِ حج کا ایک بار آپ نے خود ان الفاظ میں تذکرہ فرمایا تھا:

"جہاز بندرگاہ سے چلا تو مجھے دورانِ سر شروع ہوا۔ پورے تین دن چکر اور قے میں گذر گئے۔ کھانے کی خواہش بھی نہ ہوئی۔ چوتھے دن طبیعت کو ذرا سکون ہوا، تو بھوک لگی۔ میں نے ایک دیگچی میں مونگ کی کھچڑی نکال کر پکنے کے لئے چولہے پر رکھی پکانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ دیکھا تو پانی اوپر آ گیا اور دال گل گئی مگر چاول جوں کے توں۔ نمک اس قدر تیز کہ منہ تک نہ لے جائی جا سکے۔ خاموش ہو کر اپنی جگہ آن بیٹھا اور دیگچی ایک طرف رکھ دی۔ بھوپال کے کسی قریبی علاقے کے ایک نواب صاحب بھی اسی جہاز میں سفر کو جا رہے تھے میری عمر کا اس وقت چوبیسواں سال اور شباب کا زمانہ تھا۔ اتفاق سے ان کا اس طرف گزر ہوا، مجھ پر نظر پڑی، پوچھنے لگے صاحبزادے تمہارے ساتھ کون ہے؟ میں نے برجستہ جواب دیا اللہ۔ یہ سن کر وہ خاموش چلے گئے، اور اپنی جگہ پہنچ کر مجھے بلایا۔ میں گیا تو انہوں نے میری دعوت کی اور فرمایا، صاحبزادے تم کھانا ہمارے ہی ساتھ کھایا کرو۔ میں نے کہا' یوں تو کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہاں کوئی خدمت مجھ سے لیجئے تو انکار نہیں۔ وہ سوچنے لگے، پھر مجھ سے پوچھا تمہیں لکھنا آتا ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں آتا ہے' اور لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا۔ میرا خط دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ کسی کتاب کا مسودہ ان کے ساتھ تھا۔ اسے خوشخط نقل کرنے کے لئے میرے حوالے کر دیا۔ میں نے روزانہ کی کارگزاری صفحات کی تعداد میں مقرر کر لی۔ اور کھانا ان کے ساتھ کھانے لگا۔ جدہ شہر میں داخل ہو کر میں نے اصل مسودہ اور اس کی نقل نواب صاحب کو پیش کر کے اجازت چاہی۔ ہر چند انہوں نے اصرار کیا کہ میں تم کو واپس وطن تک علیحدہ نہیں کر سکتا لیکن میں نے کہا، یہاں میں نوکری کے لئے نہیں آیا اللہ کے گھر حاضر ہو کر بھی بندگانِ خدا کا محتاج بنا رہا تو حاضری کا لطف ہی کیا ملا؟ غرض ان سے رخصت ہو کر اونٹ پر سوار ہوا۔ اور چل دیا۔ مکہ مکرمہ میں تو میرا گویا گھر تھا کہ اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تشریف رکھتے تھے۔ سیدھا حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور دونوں وقت پکی پکائی کھانے لگا۔ سارا وقت حرم شریف میں حضرت حاجی صاحب کے ساتھ گزرتا۔ حج سے فارغ ہو کر قافلے کے مدینہ منورہ چلنے کا وقت آیا، چاروں طرف یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ راستہ محفوظ اور مامون نہیں، جان و مال ہر قسم کا خطرہ ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے مجھ سے فرمایا: مولوی خلیل احمد کہو کیا ارادہ ہے؟ سنتا ہوں کہ مدینہ منورہ کے راستے میں امن نہیں ہے اس لئے حجاج بکثرت وطن واپس جا رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا: حضرت میرا قصد تو مدینہ طیبہ کا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ موت کے لئے جو وقت مقرر ہو چکا وہ کہیں بھی نہیں ٹل سکتا اور اس راستے میں آ جائے تو زہے نصیب کہ مسلمان کو اور چاہیئے کیا؟ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے یہاں تک پہنچا دیا۔ اب اگر موت کے ڈر سے مدینہ طیبہ کا سفر چھوڑ دوں، تو مجھ سے زیادہ بدنصیب کون؟

یہ سن کر اعلیٰ حضرت کا چہرہ خوشی کے مارے دمکنے لگا۔ فرمایا بس بس تمہارے لئے یہی رائے ہے کہ ضرور جاؤ اور انشاء اللہ تعالیٰ پہنچو گے۔ چنانچہ میں حضرت سے رخصت ہو کر مدینہ منورہ روانہ ہوا اور جس طمانیت و راحت کے ساتھ پہنچا وہ میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ تقریباً دس ہفتے حاضر آستانہ رہا اور پھر بخیر و عافیت واپس وطن پہنچ کر حضرت امام ربانی مولانا گنگوہی کا قدم بوس ہوا۔"

۱۲۹۵ھ میں مولوی شمس الدین صاحب چیف جج ریاست بہاولپور نے مولانا محمد یعقوب کی خدمت میں دیوبند کو ایک خط بھیجا اور ایک

قابل مدرس کی طلب کے لئے درخواست کی کہ نوجوان ذکی، فہیم اور سلیم مدرس درکار ہے جو اپنے علم پر عامل اور مجسم صلاح ہو کہ صورت سے نیک روی کا سبق لیا جا سکے۔ مولانا یعقوب نے آپ کو طلب فرما کر حکم دیا کہ بہاولپور چلے جاؤ۔ آپ نے ہر چند عذر کیا کہ جن شرائط کا انہیں مدرس درکار ہے وہ شرائط مجھ میں مطلق نہیں پائی جاتیں۔ مگر مولانا یعقوب نے فرمایا:

میاں! رہنے بھی دو۔ لکھنے والے یونہی لکھا کرتے ہیں اور اہل علم اپنے کو یونہی سمجھا کرتے ہیں۔ تمہیں اپنی نا اہلی یہیں نظر آتی ہے کہ سر پر بڑے موجود ہیں۔ باہر جا کر دیکھو گے تو اتنا بھی کسی کو نہ پاؤ گے۔ اس وحشت کو دور کرو اور اللہ کا نام لے کر چلے جاؤ۔"

بالآخر مولانا خلیل احمد تیس روپے ماہوار پر مدرس ہو کر بہاولپور چلے گئے۔ مولوی شمس الدین صاحب چیف جج بہاولپور ایک علم دوست اور دینیات سے مناسبت رکھنے والے شخص تھے اور اپنے بچوں کو علوم دینیہ کی تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مولانا کو دیکھا، پرکھا اور بہت خوش ہوئے۔ اپنے ہی مکان پر رہنے کا انتظام کیا۔ آپ ان کے بچوں کو پڑھانے لگے۔ یہیں ۱۲۹۷ھ میں آپ کو شمس الدین صاحب کے ساتھ دوسرے حج پر جانے کا موقع نصیب ہوا اور یہی وہ مبارک سفر ہے جس میں اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ نے آپ کو خلافت نامہ اور عمامہ عطا فرمایا تھا۔

کچھ عرصے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ مولوی شمس الدین چیف ججی سے برخواست کر دیئے گئے اور انہوں نے مولانا خلیل احمد کی تنخواہ تیس روپے سے گھٹا کر دس روپے کر دی۔ مولانا کا بیان ہے:

"پردیس میں اتنی قلیل تنخواہ پر رہنا بھی مشکل تھا، مگر مروت تقاضا بھی نہ کرتی تھی کہ زیادہ کا مطالبہ کروں، یا کمی پر چھوڑ کر چلا آؤں۔ اتفاق سے فرمانروائے بہاولپور نواب صادق محمد خاں عباسی چہارم کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا اور ان کے ایصالِ ثواب کی غرض سے چند مدارسِ دینیہ ریاست کی طرف سے جاری کئے گئے جن میں ایک خاص مدرسہ بہاولپور میں کھولا گیا چونکہ اس مدرسے کی کوئی عمارت مقرر نہ تھی، اس لئے مولوی محمد حسین وزیر ریاست نے مولوی شمس الدین ہی کا مکان تجویز کر کے میرا تقرر بیس روپے مشاہرے پر کر دیا کہ مدرسہ کے ساتھ ساتھ جج صاحب کے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی چلتا رہے اور میری تنخواہ بھی تیس روپے پوری ہو جائے، لیکن چند ماہ بعد جج صاحب دس روپے ماہوار بھی نہ دے سکے اور پھر وزیر ریاست نے میری تنخواہ مدرسے سے ہی تیس روپے کر دی۔"

جون ۱۸۸۱ء میں ترقی ہو گئی، حتیٰ کہ گیارہ سال پورے ہونے پر جولائی ۱۸۸۹ء میں آپ نے بہاولپور چھوڑ دیا اور وطن واپس چلے گئے۔ جس طرح منطق و کلام کے علومِ عقلیہ کی تعلیم ہوتی تھی، اسی طرح فقہ، حدیث اور تفسیر کا درس بھی ہوتا تھا۔ آپ بڑی شفقت اور محبت سے طلباء کو پڑھایا کرتے تھے۔ آپ کے تلمیذ رشید مولانا عزیز الرحمٰن بہاولپوری کی روایت ہے کہ طلبہ پروانوں کی طرح حضرت کے والہ و شیدا تھے۔ آپ کا زیادہ وقت درسِ حدیث میں صرف ہوتا۔ آپ کو ہزاروں حدیثیں اور بالعموم صحاح کے احادیث کی سندات تک حفظ تھیں۔ کسی مسئلے کے بارے میں محض اپنے حافظے سے تمام علمی اور مذہبی معلومات کو یکجا بیان فرما دیتے تھے۔ عوام پر آپ کے تقدس کا اسقدر اثر ہوتا کہ بے اختیار تعظیم کے لئے مجبور ہو جاتے۔ مسلمانوں کا کیا ذکر ہندو بھی آپ کو سرِ دست کھڑے ہو کر سلام کرتے۔ آپ اپنی طرزِ اسلاف اور وضع داری میں نہایت پختہ تھے اور کوئی بڑی سی بڑی ہستی آپ کو روک نہ سکتی۔ ۱۸۸۶ء میں جب شعبۂ دینیات کا تعلق ایجرٹن کالج سے ہوا تو تعلیم کے لئے کالجوں کے دستور کے مطابق میزیں اور کرسیاں بچھائی گئیں، مگر آپ نے اسے قبول نہ کیا اور صاف انکار کر دیا کہ مجھے کرسی پر اور طلبہ کو بنچوں پر بیٹھنے کے لئے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ اسی وقت آپ کے لئے درس گاہ میں دری کا فرش اور اس پر قالین بچھایا گیا اور آپ اسلاف کے طریقے پر بیٹھ کر درس دیتے رہے۔ ایک مرتبہ وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن کالج دیکھنے آیا اور اسے معلوم ہوا کہ یہاں عربی مدرسہ بھی ہے چونکہ اسے عربی زبان سے دلچسپی تھی اس لئے شعبۂ دینیات کی طرف بھی آیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں مذہبی تعلیم ہوتی ہے اس لئے جوتے پہن کر کمرے کے اندر جانا منع ہے، لہذا دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ آپ دروازے تک آئے اور باتیں ہونے لگیں۔ آخر میں اس نے پوچھا آپ نے کہاں تعلیم پائی ہے؟ یہ سوال کچھ ایسے انداز پر کیا کہ آپ کو سخت ناگوار گزرا اور مدرسۂ دیوبند اس زمانے میں انگریزی حکومت کی نظر میں کھٹکتا تھا، اس لئے غصے کی وجہ سے آپ کی آواز بھرا گئی اور آپ نے جوش کے ساتھ فرمایا:

"میرا سلسلۂ تلمذ دیوبند کے ساتھ وابستہ ہے۔"

ریاست میں بعض مقتدر حضرات ایسے بھی تھے جو آپ سے بغض للّٰہی رکھتے اور خواہ مخواہ اذیت دیا کرتے تھے۔ کبھی مذہبی مباحث چھیڑ دیتے، کبھی کچھ اور الزام تراشیاں کرتے اور کبھی میدانِ مناظرہ میں گھسیٹ لاتے۔ ان دینی مباحث اور مناظروں میں آپ ہمیشہ غالب آتے رہے اور مخالفین کو سوائے خفت اور ندامت کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس کے بعد انہوں نے مزید دشمنی پر کمر باندھی اور آپ کو جسمانی تکلیف دینے کے منصوبے باندھنے لگے۔ چنانچہ تھانیدار کے نام حکم آیا کہ آپ کو گرفتار کر لیا جائے، مگر خود تھانیدار نے اسوقت جبکہ آپ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے آپ کو اس کاروائی کی اطلاع دیدی۔ آپ شب میں اسٹیشن پر آئے اور گاڑی پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔

بہاولپور سے واپس آئے تو حافظ محمد جعفر خاں صاحب بریلوی کی درخواست پر حضرت گنگوہی نے مولانا خلیل احمد کو چالیس روپے

ماہانہ مشاہرہ پر مدرسہ مصباح الاسلام کا مدرس اوّل بنا کر بریلی بھیج دیا۔

مدرسہ مصباح الاسلام کا افتتاح ۱۲۸۵ھ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے فرمایا تھا۔ حافظ جعفر خاں بڑے تاجر اور دولت مند آدمی تھے۔ مولانا کی کوششوں سے مدرسے کو بہت ترقی ہوئی۔ طلبہ اور اراکان مدرسہ سبھی آپ کے علم و فضل اور خلق و دیانت کے معتقد ہو گئے۔ کم و بیش دو برس آپ نے بریلی میں قیام فرمایا اور آخر کار مولانا گنگوہی کی تجویز پر تیس روپے ماہانہ پر دار العلوم دیوبند چلے گئے۔ مدرس اوّل شیخ الہند مولانا محمود حسن تھے۔ ان کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار تھی ــــ

شیخ الہند، مولانا خلیل احمد سے عمر میں ایک سال بڑے تھے۔ اس ہم عصری کے ساتھ بچپن میں کچھ دن دونوں ہم سبق اور ہم مکتب بھی رہے۔ پھر مولانا گنگوہی کے دامن گرفتہ اور پیر بھائی ہونے کے تعلق نے تو اس یگانگت کو ایسا شیریں بنا دیا کہ گویا ایک جان اور دو قالب تھے۔

مولانا خلیل احمد چھ سال دار العلوم دیوبند میں رہے۔ مسلم شریف کا درس آپ خاص التزام سے پڑھاتے۔

۱۳۱۴ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس اوّل کی جگہ خالی ہوئی۔ ممبران مدرسہ نے مولانا گنگوہی کو لکھا کہ خلیل احمد صاحب کو مدرس اوّل بنا کر یہاں بھجوا دیا جائے۔ یوں بھی مدرسے کا ان پر حق ہے کہ وہ مولانا محمد مظہر بانی مدرسہ کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ مولانا گنگوہی نے یہ درخواست منظور کر کے آپ کو سہارنپور جانے کا حکم دیا اور آپ اس حکم کی تعمیل میں دیوبند سے سہارنپور آ گئے۔ اہل و عیال بھی آپ کے ساتھ تھے۔ اگرچہ تنخواہ چالیس روپے تھی لیکن مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی روپیہ خرچ ہو جاتا کہ وطن قریب تھا اور رشتے داروں کی آمد و رفت بکثرت ہوتی۔ ادھر گنگوہ کا قرب اور آپ کو اپنے مرشد کی زیارت کا شوق ہر جمعے کے جمعے حاضری پر مجبور کرنے لگا۔ سخاوت اور مروت خمیر میں تھی، اس لئے سفر میں جتنے رفقا آپ کے ساتھ ہوتے، ان سب کا کرایہ خود ادا کرنے کی کوشش کرتے۔ پھر کنبہ کثیر اور برادری بڑی، اس لئے شادی اور غمی کی تقریبات میں اہل و عیال سمیت شرکت کو بھی آپ حسنِ معاشرت اور صلۂ رحمی کے درجے میں ضروری سمجھتے تھے۔

ان تمام وجوہ سے آپ ہمیشہ تنگ دست رہے، لیکن استقلال اور توکل کے باعث پریشانی کا کبھی اثر نہ لیا اور یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں کہ زیادہ تنخواہ پر دوسری جگہ چلے جائیں یا کسی ریاست سے وظیفۂ اعانت کے خواہشمند ہوں۔ جب قرض زیادہ ہو جاتا، تو جدّی ترکے میں سے کوئی جزو فروخت کر کے سبک دوش ہو جاتے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ایسے مستعد کہ ماتحت مدرسوں پر بھی اس کا اثر خود بخود پڑتا۔ وقت مقررہ سے حاضری میں ذرا بھی کسی کو دیر ہوتی تو وہ آپ کو موجود اور پڑھانے میں مشغول دیکھ کر خود شرما جایا کرتا تھا۔ وقت کی پابندی اور ایفائے عہد پر مداومت آپ کے لئے کچھ ایسی طبعی بن گئی تھی کہ آندھی ہو یا مینہ، صحت ہو یا مرض، دن ہو یا رات، کسی بڑے سے بڑے مانع و مزاحم سے بھی متزلزل نہ ہوتے تھے۔ دو چار نہیں صدہا واقعات ایسے ہیں جن سے ایفائے عہد اور پابندی وقت کی شہادت ملتی ہے۔ تقریر گویا موتیوں کی لڑی تھی۔ بڑے درجے کی پندرہ سولہ ضخیم کتابوں کا سال سے پہلے کام کرا دینا آپ کے لئے معمولی بات تھی۔ کامل چھ سات گھنٹے درس دینا اور دماغ و زبان سے کام لئے جانا آپ کی عادت بن گیا تھا۔ درس سے فارغ ہو کر فتاویٰ نویسی میں مشغول ہوتے۔ اس کے علاوہ خطوں کے جواب۔ ضروری سے ضروری کام آپ مدرسے کا وقت ہو جانے پر ملتوی کر دیتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ گھر میں اناج یا آٹا نہیں اور مدرسے جانے کا وقت ہو گیا۔ آپ مدرسے آ جاتے اور منتظر رہتے کہ کوئی دوست آ جائے تو اس سے آٹا منگوا کر گھر بھیجا جائے۔ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی نہ آتا یا آپ مشغولیت میں بھول جاتے اور جب فارغ ہو کر کھانے کا وقت آتا تب خیال ہوتا کہ آٹا تو تھا ہی نہیں، روٹی کہاں پکی ہوگی۔

۱۳۱۴ھ سے آخر تک آپ کا تعلق مدرسہ مظاہر العلوم سے رہا اور کامل اکتیس برس آپ نے ایک جگہ بیٹھ کر علوم دینیہ کی خدمت تدریس میں صرف کئے۔ ۱۳۳۰ھ تک کامل سولہ برس گزرے کہ آپ کی تنخواہ میں ایک روپیہ کی بھی ترقی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد جب تمام ملازمین مدرسہ کو ترقیاں دی گئیں، تو آپ کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ کر دیا گیا جسے آپ نے بڑی مشکل سے قبول کیا اور یہی فرماتے رہے کہ چالیس روپے ہی کے قابل کام کرنا مشکل ہے، اب پچاس روپے کیسے وصول کروں؟

آپ جس دن سے مدرسے میں آئے تھے اسی دن سے اس کی ترقی کی فکر آپ کو تھی اور یہ آپ کی اچھی نیت اور خلوص کا ثمرہ تھا کہ وہ مدرسہ جو کسمپرسی کے عالم میں تھا پنپنے لگا اور تیز رفتاری سے دوڑنے لگا۔ طلبہ کی کثرت ہوئی، مدرسین کا اضافہ ہوا، چندے میں توسیع ہوئی، نایاب کتابوں کی خرید ہونے لگی اور نہایت عالیشان کتب خانہ بن گیا۔ خالی چھتوں پر درس گاہیں تعمیر ہوئیں، ماہر تجوید قاریوں کا تقرر ہوا، مفتی رکھے گئے اور فتاویٰ نویسی کا مستقل انتظام ہوا۔ آہستہ آہستہ محسوس ہوا کہ موجودہ مکان مدرسے کے لئے ناکافی ہے۔ مدرسین کے لئے جگہ ہے نہ طلباء کے لئے۔ مختلف محلوں میں ان کی روٹیاں مقرر۔ اور ہر روٹی دینے والا ان پر حکومت جتلانے کو تیار۔ یہ حالت دیکھ کر آپ نے محض توکلاً علی اللہ ایک وسیع زمین خرید کر تعمیر کی بنیاد ڈال دی کہ اوپر کے حصے میں جدا جدا درس گاہیں ہوں اور نیچے طلباء کی رہائش کے لئے بہت سے حجرے۔

آپ مولوی تھے۔ درسی کتابوں یا مدرسے کی چٹائیوں کے سوا کسی چیز سے کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔ خدا جانے انجینئری اور تعمیر کا فن کہاں سیکھا کہ محض اپنی تجویز سے نقشے بنائے اور خود کھڑے ہو کر راجوں مستریوں سے اوّل تا آخر تعمیر کرائی۔ ۱۳۳۷ھ میں جب یہ عالیشان عمارت بن کر تیار ہوئی تو دیکھنے والے ماہرین فن حیران ہو جاتے اور ستر پچھتر ہزار کی لاگت کا تخمینہ کیا کرتے

حالانکہ اس میں چالیس ہزار بھی پورا صرف نہ ہوا تھا۔ مدرسے کے متصل ہی ایک خوشنما مسجد بھی آپ نے بنوائی جس میں تمام محلے والے، طلبہ اور مدرسین آسانی سے نماز ادا کر سکیں۔ فرش شاہانہ دری اور روشنی کا بھی خوب انتظام کیا گیا۔ یہ مسجد بھوپال کی ایک نیک دل خاتون کلثوم جہاں بیگم نے اپنے روپے سے تیار کروائی تھی۔ حضرت نے طلبہ کے لئے مطبخ بھی بنوایا جہاں سے طلبہ کو کھانا ملتا تھا۔ ۱۳۱۴ھ میں آپ یہاں آئے تو کتب خانے میں صرف چند فنون پر مشتمل کتابوں کی تعداد صرف ۱۱۰۷ تھی مگر جب ۱۳۴۴ھ میں آپ مستقل طور پر سرزمینِ حجاز چلے گئے تو تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، اسماء رجال، فقہ، اصول فقہ، عقائد، معانی، فرائض، کلام، مناظرہ وعظ، ادب، عروض، تجوید، تصوف، منطق ریاضی، صرف و نحو غرض معقول و منقول کی کوئی گیارہ ہزار کتابیں جمع ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد بھی آپ نادر و نایاب کتب خرید کر مدینہ منورہ سے برابر مدرسے کو بھیجتے رہے۔

آپ طلبہ کے بارے میں جہاں تک تعلیمی امور کا تعلق تھا، بہت سخت تھے اور امتحان میں کسی ادنیٰ رعایت کو بھی پسند نہ فرماتے۔ طلبہ کی عملی اور اخلاقی حالت پر بھی نگاہ رہتی اور اس معاملے میں کسی رُو رعایت کے قائل نہ تھے اور نہ کسی کی سفارش سنتے۔ اسی طرح مدرسین کے احترام کا آپ کو خاص اہتمام تھا اور ان کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ فرمایا کرتے۔ اکثر اوقات استاد اور شاگرد کے درمیان کوئی قضیہ ہوتا جس میں غلطی استاد کی ہوتی، تو نہایت حسنِ تدبر سے دونوں پہلو سنبھالا کرتے۔ انتظامی امور کے سلسلے میں آپ کو یہ کمال حاصل تھا کہ ہر شعبے کی نگرانی بغیر وقت صرف کئے فرماتے۔ کسی کام میں مشغول ہوں، خیال چاروں طرف رہتا اور کسی شعبے کی جانب سے غفلت نہ ہوتی تھی۔ دفتر کے تمام رجسٹروں کی خانہ پُری اور حساب و کتاب کی صفائی کا بڑا خیال رکھتے۔ ہر شعبے کے ملازمین کا وقت پر آنا آپ کی ادنیٰ توجہ اور ہیبت خداداد کی بدولت اتنا قابو میں تھا کہ چند منٹ کی غیر حاضری چھپا لینے پر کوئی بھی قادر نہ تھا۔ ان مشاغل میں گھرے ہونے کے باوجود برسوں کا حاضر باش کوئی ایک شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ فلاں نماز کی تکبیر تحریمہ حضرت سے چھوٹ گئی یا فلاں شب تہجد کے لئے آنکھ نہ کھلی۔

۱۳۱۴ھ میں جب آپ مظاہر علوم میں صدر مدرسی کے عہدے پر آئے تو قدرت نے آپ کے ذوقِ طبعی کا سامان مہیا فرما دیا اور آپ کے سپرد حدیث ہی کے اسباق ہوئے کہ کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بحر ذخائر سے گوہر آب دار نکالیں اور اطرافِ دنیا سے جمع ہونے والے مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نچھاور کر دیں۔ کتبِ حدیث میں ابوداؤد شریف کو آپ بالخصوص مشکل سمجھتے اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ ابوداؤد کی بعض عبارتیں ایسی دقیق ہیں کہ مہارتِ فن کے بعد بھی ان کا حل مشکل ہے۔ نیز صاحبِ ابوداؤد نے ابوابِ فقہیہ کے جمع کرنے کا خود بھی اہتمام کیا اور گویا محدث و فقیہ دونوں کا منصب پورا کیا ہے اس لئے اس کی شان اور وقتِ استنباط بڑھ گئی۔ پھر اس کی کوئی شرح بھی ایسی شافی و کافی نہیں جو اس کے مطالب حل کرنے میں مدد دے سکے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کے قلب میں یہ آرزو تھی کہ ابوداؤد شریف کی شرح لکھیں، مگر کام معمولی نہ تھا۔ وقت بھی چاہتا تھا اور دماغ بھی تر و تازہ، ذکی اور ادھر اُدھر کے افکار سے فارغ، اس لئے شوق اور ولولہ آپ کی ہمت ابھارتا رہا، مگر موانع و مشاغل کا ہجوم ہمیشہ پست کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ تین مرتبہ آپ نے خیال کو عزم کے درجے میں لا کر قلم اٹھایا اور کام شروع کیا مگر تکمیل کو نہ پہنچا اور اب اس بڑھاپے میں آپ کا کسی معمولی تصنیف کی طرف متوجہ ہونا بھی بڑی ہمت تھی، چہ جائیکہ حدیث کی شرح اور وہ بھی ابوداؤد کی جس کا عبارت کے لحاظ سے بھی صحیح نسخہ ملنا دشوار تھا۔ تاہم آپ نے اللہ کا نام لے کر یہ عظیم کام شروع فرما دیا اور ۲ ربیع الاول ۱۳۳۸ھ کو کتب خانے سے وہ تمام کتابیں نکالی گئیں جن کی شرح کے لئے ضرورت تھی۔ شوال ۱۳۴۴ھ میں آپ حجاز مقدس تشریف لے گئے تو آستانۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہ کام جاری رہا اور وصال سے دو ماہ قبل پوری شرح مکمل فرما کر خود بھی عشقِ رسول میں ختم ہو گئے۔ اس شرح کا نام ہے "بذل المجهود فی حل ابی داؤد"

ابوداؤد کی یہ شرح پورے دس برس پانچ ماہ دس دن میں بڑی تقطیع کے تقریباً دو ہزار صفحات میں پانچ جلد ہو کر ختم ہوئی ہے اور اس کے ختم پر آپ کو ایسی مسرت ہوئی جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی خوشی نہیں کر سکتی۔ آپ نے ختم شرح پر ۲۳ شعبان ۴۵ھ یوم جمعہ علمائے مدینہ اور احباب حاضرین کی ضیافت کا اہتمام کیا کہ آپ کا رُواں رُواں شکر الٰہی میں چُور اور انعام باری تعالیٰ پر فرحاں و مسرور تھا۔

آخر عمر میں بذل المجهود سے فارغ ہو کر اہلِ مدینہ کے اصرار پر مدرسۃ الایتام میں آپ نے درس دینا شروع کیا لیکن چند سباق سے زائد نہ ہونے پائے تھے کہ آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ سلطان عبدالعزیز آپ کے تبحرِ علمی اور تقویٰ و تقدس کے باعث بے حد احترام کرتا تھا مسجد نبوی میں عصر کی نماز عموماً ادا کرتا اور اسی جگہ آ کر بیٹھتا جہاں آپ ابتدا سے بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دن سلطان نے فرمایا: میری خواہش ہے کہ کبھی آپ میرے مکان پر تشریف لائیں۔

آپ نے جواب دیا: میری عمر اتنی مسافت طے کرنے کی متحمل نہیں ہے۔

سلطان نے کہا جب آپ ارشاد فرمائیں موٹر حاضر ہو جایا کرے۔

آپ نے فرمایا: یہ پیدل چلنے سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ سوال کروں اور موٹر کے انتظار میں بیٹھا رہوں۔ تاہم ایک مرتبہ سلطان کے اصرار پر آپ ان کے ہاں تشریف لے گئے۔

آپ کو امراء اور حکام سے ملاقات میں طبعاً وحشت ہوتی تھی اور اگر کبھی ملنا بھی ہوتا تو ان سے کبھی مرعوب نہ ہوئے اور نہ امر بالمعروف سے چُوکے اور نہ دینی نفع اٹھائے بغیر رہے۔

آپ چاہتے تو اپنے لئے بھوپال، بہاولپور اور

حیدر آباد سے وظائف کا تعرّض کچھ بھی دشوار نہ تھا خطاب یا عہدے کا وسوسہ تو کیا ہوتا، بڑوں کی کسی ملاقات سے آپ نے دنیا کا قلیل فائدہ اٹھانا بھی گوارا نہ کیا۔ آپ کی دقیق نظر نے تو مخلصین کے ہدیوں اور تحفوں میں پس وپیش کا سلسلہ قائم رکھا اور ذرا شبہ ہُوا تو رد فرمادیا۔ آپ کی صاف گوئی مشہور تھی۔ جب کہتے بے لاگ لپیٹ بات کہتے تھے۔ اللہ نے آپ کو نسبت عبدیت سے نوازا تھا کہ اتباعِ شریعت میں گھُل مِل جانے کے سوا آپ پر کسی حال کا غلبہ نہ تھا اور صرف استقامت کا رنگ آپ پر چڑھا ہوا تھا۔ زبان، دل اور بدن کا رُواں رُواں بس یہ پکارتا تھا کہ اتباعِ سنت میں فنا ہوجا۔ عادات ہوں یا عبادات ہر حال اور ہر امر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو اپنا امام، اپنا ہادی اور اپنا پیشوا اور رہبر بناؤ کہ اس کے سوا کوئی صورت فلاح کی نہیں۔

اس آخری سفر میں حضرت اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وسطِ شعبان میں بذل المجہود کی تالیف ختم فرمائی اور ادھر لقائے رب کا شوق بڑھنے لگا اور ادھر کشش اپنا کام انجام دینے لگی تعلقات سے یکسوئی ہونے لگی، خلوت و تنہائی سے انس بڑھ گیا، تلاوت کلام اللہ کی رغبت اتنی ہوئی کہ دیکھنے والے ترس کھاتے اور اس ضعیفی میں تعلیق ابوداؤد کی ناقابلِ برداشت محنت سے دماغ تھک گیا ہے اب اس پر رحم فرمائیے" مگر آپ جواب دیتے کہ دماغ سے اب کام ہی کیا لینا باقی ہے جو رعایت کروں۔ اچھا ہے جس نے دیا ہے، اسی کے کام آئے۔ صبح کو کھانے سے قبل تین چار پارے خود تلاوت کرتے اور بعد ظہر دو پارے اہلیہ کو سناتے۔ بعض آیات پر بے اختیار گریہ غالب ہوجاتا اور رونے لگتے تھے۔ ترجمہ کرکے اہلیہ کو سُناتے۔

ماہِ رمضان قریب آچکا تھا اور زندگی کا یہ آخری رمضان تھا اس لئے آپ نے اپنے متوسلین کو خطوط لکھ دیئے کہ آئندہ جواب کا انتظار نہ دیکھیں آہستہ آہستہ امراض و عوارض کے ہدایا پیش ہونے لگے۔ پہلے سخت نزلہ ہوا، پھر بخار آیا اور کئی دن آستانۂ محبوب تک جانے کی طاقت نہ رہی رمضان کی خاطر افاقہ ہوا اور وہ مبارک مہینہ مجاہدۂ تامّہ میں گزرا۔ رات دن کے چوبیس گھنٹے اور دو چار فنجان چائے اور بمشکل آدھی چپاتی۔ دن بھر تلاوت اور رات بھر سماعت کہ شاید سونے کے لئے تین گھنٹے بھی نہیں تھے۔ رمضان ختم نہ ہوا تھا کہ شدید تپ لرزہ ہوا اور اسی میں فالج کا اثر لیکن آپ نے وطن والوں کو اطلاع نہ دی کہ خدام پریشان ہوں گے۔ اس حالت میں بھی جب معمولی افاقہ علاج معالجے سے ہوا لکڑی اور آدمی کے سہارے آستانۂ محبوب پر حاضر ہونا پھر شروع کردیا۔ پاؤں بڑی تکلیف سے اٹھتے اور گویا گھسیٹتے ہوئے چلتے تھے۔ مگر پنجگانہ اوقات میں حاضر ہوجایا کرتے تھے۔ اب عجب کیفیت میں دن گذرنے لگے کہ شوقِ لقاء کہتا تھا جلد وہ دن آئے کہ قفسِ عنصری کا جال ٹوٹے اور ادب کہتا تھا کہ چپ رہو سنتِ الٰہیہ کے غلام بنے ہوئے کام کئے جاؤ۔ نہایت حسرت اور مسرت کا مخلوط عالم تھا۔ ان خوابوں اور رؤیائے مبشرات کا خیال آتا جو عرصے سے بار بار دیکھ رہے تھے، تو امید بڑھتی تھی کہ ضرور یہاں کی خاک پاک میں ملنا نصیب ہوگا اور شہنشاہ کی بے نیازی اور جلالت شان پر نظر جاتی، تو خوف ہوتا کہ دیکھئے کیا مقدر ہے۔

بعض علمائے مدینہ کے اصرار پر آپ نے ابوداؤد شریف کا درس شروع کیا۔ عصر کی نماز کے بعد ابھی دو دن ہی درس دیا تھا کہ تیسرے روز ظہر کی نماز مسجد نبوی میں پڑھ کر واپس ہوئے تو راستے میں فرمایا: سینے کے اوپر کے حصّے میں آج پھر درد محسوس ہورہا ہے۔ اس سے تین چار دن پہلے بھی ایسا ہی درد ہوا تھا جو مالش اور سنکائی سے دو تین گھنٹے میں جاتا رہا تھا۔ گھر پہنچ کر یہی علاج پھر کیا گیا جس سے درد تو کم ہوگیا لیکن درد بہت بڑھ گیا اور عصر کی نماز کے لئے مسجد نبوی تک جانے کی طاقت نہ رہی۔ پھر ضعف اور بڑھا کہ بدن میں بجائے حرارت کے خنکی اور پسینہ تھا۔ مغرب کی نماز کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے۔ بیٹھ کر پڑھی۔ عشاء کی نماز کے لئے پلنگ سے نیچے اترنا بھی دشوار ہوگیا۔ چنانچہ پلنگ ہی پر بیٹھ کر پڑھی۔ تمام رات کلمہ و استغفار اور درود وردِ زبان رہا۔ نیند مطلق نہ آئی۔ نماز فجر بھی پلنگ پر بیٹھ کر پڑھی، لیکن پسینہ برابر بڑھتا جارہا تھا اور وقت پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ یہ صبح ہوش و حواس کی آخری صبح ہے۔ دن میں خدام دوا وغیرہ کا اہتمام کرتے رہے، مگر نہ پیشاب ہوا نہ کوئی دوا ہضم ہوئی۔ ظہر کے وقت اتنا ضعف ہوگیا کہ وضو کرنے کی بھی طاقت نہ رہی اور تیمم کرکے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھی۔ اس کے بعد حرکت سکون دوسرے کا محتاج ہوگیا۔ عصر کے وقت ہوش و حواس صحیح نہ رہے اور امام کی آواز پر خود رکوع نہ کیا بلکہ ایک خادم نے رکوع کا لفظ کہہ کر اشارہ کیا تو رکوع کیا اور جب سجدے کو کہا تو سجدہ کرلیا۔ مغرب کے وقت بالکل غفلت طاری ہوگئی اور خدام نے نماز کے لئے پکار کر اطلاع کی، مگر کچھ جواب نہ ملا۔ گویا دنیا سے قطع تعلق ہوچکا تھا اور پاس انفاس کے سوا کوئی حرکت تھی نہ کسی بات کا جواب۔ شب میں ایک دو مرتبہ آبِ زمزم منہ میں ڈالا گیا تو اس کے حلق سے اُترنے میں بھی تکلف ہُوا، لہٰذا وہ بھی ترک کردیا گیا۔ پورے چوبیس گھنٹے اس عالمِ خاموشی میں گزار کر یوم چہار شنبہ کو عرب میں ۱۶ اور ہندوستان میں ربیع الثانی کی ۱۵ تاریخ کو منزلِ مقصود پر پہنچ لئے کہ باآوازِ بلند اللہ اللہ کہنا شروع کیا اور دفعتاً آنکھیں بند کرکے ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے۔ جلد جلد جنازہ تیار ہُوا اور آستانۂ محمدیہ پر باب جبریل کے باہر صلوٰۃِ جنازہ کی جگہ لاکر رکھا گیا۔ مدرسہ شرعیہ مدینہ کے صدر مدرس مولانا شیخ طیب نے نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع کو لے چلے۔ وقت اتنا کم تھا کہ کسی کو اطلاع دینے کا موقع ہی نہ ملا۔ بایں ہمہ جنازے کے ساتھ خلقت کا وہ ہجوم تھا کہ بہت سوں کو کوشش کے باوجود کندھا دینا نصیب نہ ہوا۔ قبۂ اہل بیت کے قریب عشاء سے ذرا قبل آپ کو لحد کی آغوش میں دے دیا گیا اور بالآخر آپ کی وہ دیرینہ آرزو پوری ہوئی کہ کاش میری مٹی بقیع کی خاکِ پاک میں مل جائے۔ باقی صــ۲۸ پر

ظہور الدین بٹ

فوج کے سپاہیوں کو کھانے کے لئے

روزانہ صرف مٹھی بھر جوار ملتی تھی۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی واحد جماعت ایسی تھی جس نے

تن تنہا برطانوی امپریلزم سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا

شاہ عبدالعزیزؒ کے فتاویٰ صادر کرنے کے بعد مسلمانوں کا جنگ جو طبقہ جو آپ کے خاندان سے بے انتہا عقیدت رکھتا تھا اور جن میں روہیلہ پٹھان خصوصی طور پر شامل تھے، ان کے تعلقات مرہٹوں سے اور زیادہ مضبوط ہو گئے۔

دوسری طرف عام مسلمان جو انگریزوں کی تیز رفتار اقتدار سے اب تک حیرت زدہ تھے اور اپنے اندر مذہب کی روشنی میں فوری فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے، ان کے لئے ایک راستہ کھل گیا جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ بااہمیت طبقہ انگریزوں کے خلاف مرہٹوں سے وابستہ ہو گیا جو اس وقت انگریزوں سے برسرپیکار تھے۔

اس دور میں مرہٹوں اور مسلمانوں کے درمیان پرانی دشمنی اور جنگ ختم ہو گئی، مرہٹہ علاقوں کے مسلمان باقاعدہ طور پر ان کی فوج میں شامل ہو کر آخر دم تک انگریزوں سے لڑتے رہے بلکہ شمالی ہند کے بے شمار مسلمان بھی ان علاقوں میں پہنچے اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے۔

خود شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے خاص معتقد اور مرید سید احمدؒ کو امیر علی خاں سنبھلی کے پاس بھیجا جو جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ ایک عرصہ سے انگریزی طاقت کے خلاف گوریلا طرز کی جنگ میں مصروف تھے۔

انقلاب:

حضرت شاہ ولی اللہؒ جو بیک وقت عالم، مصلح اور سیاست داں بھی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے تجربات اور ہندوستان کی سیاسی بساط جو اس وقت مغل بادشاہوں کے لئے الٹ چکی تھی کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ ان کی سیاسی بصیرت اور مستقبل بینی نے ان پر منکشف کر دیا تھا کہ برصغیر پاک و ہند میں 'مسجد' جو بیک وقت مدرسہ بھی ہوا کرتا تھا کو آزادی کا عظیم مقصد حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی بناء پر انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ایسے مدرسے قائم کئے جو ان کی وفات کے بعد ہندی حریت پسندوں کے مراکز بنے رہے۔ ایسے مراکز کا آئندہ کسی باب میں تذکرہ کیا جائیگا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ عدم تشدد کے قائل تھے اور نہ اہنسا کے، وہ بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستان میں سیاسی اور فکری انقلاب صرف طاقت اور تبلیغ کے زور پر لایا جا سکتا ہے۔ وہ ایسی فوجی طاقت سے انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے، جس میں حریت پسندوں کی تربیت 'جہاد فی سبیل اللہ' کے اصولوں پر کی گئی ہو نہ کہ دشمن کشی اور غارت گری کی بنیاد پر۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال کے بعد جب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد مکرم کے چھوڑے ہوئے ادھورے کام کو ہاتھ میں لیا تو انہوں نے انقلابیوں کی تربیت محنت، جفاکشی، صبر و استقلال، ایثار اور قربانی کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر کی۔

ان انقلابی مسلمانوں نے جو شاہ عبدالعزیزؒ کی زیر تربیت رہے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کو خیرباد کہہ کر ان اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے میدانِ عمل میں نکلے ہیں جن کے لئے وہ اپنی عزیز سے عزیز شے حتیٰ کہ زندگی کو بھی داؤ پر لگا سکتے ہیں۔

ایسا جہاد پیشہ ور سپاہی قطعی طور پر نہیں کر سکتے مگر ایسے رضاکاروں کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے جن کی تربیت ایک خاص نہج پر ہوئی ہو جو اپنے نصب العین اور عظیم مقاصد کو بخوبی سمجھتے ہوں، نظریات کو اپنے جذبات میں ڈھال لیں۔ پھر ان کے حصول کے لئے اپنے آپ کو تج دیں۔ اور یہی ان کی زندگی کا محبوب ترین مقصود بن جائے۔

واضح ہو کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی تحریک کو تین

مختلف سمتوں میں چلایا۔ ان کی اس حکمت عملی نے تاریخ پر ثابت کر دیا کہ انہوں نے اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیابی حاصل کی۔

حکومت کا مقصد:

سید احمد شہیدؒ نے "فک کل نظام" کے تحت ایک نیا انقلابی معاشرہ قائم کرنے کے لئے جن مصائب و مشکلات کا سامنا کیا وہ انہی کا کمال تھا۔ آزاد حکومت کی امارت قبول کرنے کے بعد آپ نے سلطان ہرات، والیٔ کابل، شاہ بخارا، رئیس قلات، آزاد قبائل کے سرداروں، ہندوستان کے سرآوردہ عمائدین، علماء کرام، بعض فرمانرواؤں اور سکھ حکومت کے ذمہ داروں کو جو سفارتی خطوط تحریر کئے، ان میں آپ نے واضح طور پر تحریر کیا کہ

"خدا گواہ ہے ہمارا منشا دولت جمع کرنا ہے نہ اپنی حکومت قائم کرنا۔ ہم خدائے بالا و برتر کے ناچیز بندے ہیں۔ نہ بندگانِ خدا پر جبر و قہر کا کوئی وسوسہ ہمارے دل میں ہے اور نہ کسی سے حکومت چھین لینے کا کوئی جذبہ۔ ہمارا منشا وطن کو آزاد کرانا ہے اور بس۔ اور یہ اس لئے کہ تقاضا مذہب یہی ہے اور اسی میں رضائے مولیٰ متصور ہے۔"

آپ کا بنیادی مقصد چونکہ ہندوستان کو برطانوی سامراج کے عفریت سے نجات دلانا اور انگریزی اقتدار و تسلط کا قلع قمع کرنا تھا، جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں سخت مایوسی، پریشانی اور زبوں حالی کا شکار تھے اس لئے انہوں نے اس جد و جہد میں ہندوؤں کو بھی حصہ لینے کی دعوت دی اور انہیں صاف طور پر بتانے کی کوشش کی کہ ان کا واحد مقصد غاصبوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد کس کی حکومت ہوگی اس سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے، ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔

اس ضمن میں سید احمد شہیدؒ نے سرحد سے گوالیار کے مدار المہام اور مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کے وزیر اور برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو جو خط تحریر کیا اس میں بھی آپ نے واضح طور پر تحریر کر دیا:

"جناب کو خوب معلوم ہے کہ وہ بیگانے اور اجنبی جو وطن عزیز سے بہت دور کے رہنے والے ہیں دنیا جہان کے بادشاہ بن گئے اور سودا بیچنے والے دوکاندار (انگریز) بادشاہت کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں۔ بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بلند مرتبہ رؤسا کی ریاست کو برباد کر دیا ہے اور ان کی عزت اور ان کا اعتماد بالکل ختم کر دیا ہے۔ چونکہ وہ لوگ جو ریاست و سیاست کے مالک تھے گوشۂ گمنامی میں بیٹھ گئے ہیں۔ ناچار چند بے سروسامان فقیر کمر ہمت کس کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ کمزوروں کی یہ جماعت محض اللہ کے دین کے تقاضے سے اس خدمت کے لئے کھڑی ہو گئی ہے۔ یہ لوگ جاہ طلب، دنیا دار نہیں ہیں بلکہ ایک مذہبی اور اخلاقی فرض سمجھ کر اس خدمت کے لئے اٹھے ہیں مال و دولت کا قطعاً کوئی لالچ نہیں ہے۔

جس وقت ہندوستان کا میدان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائیگا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانے تک پہنچ جائے گا، حکومت کے عہدے اور منصب ان کے سپرد ہوں گے جو اس کے مستحق ہوں گے اور انہیں کی شوکت و عظمت کی جڑیں مضبوط کی جائیں گی۔ ہم کمزوروں کو بڑے بڑے رؤساء اور بلند مرتبہ عمائدین سے صرف اتنی بات درکار ہے کہ اہلِ اسلام کو ان کا مالی تعاون حاصل رہے اور مسند حکومت ان کو مبارک ہو۔"

ریاست گوالیار کے ایک مسلمان عہدیدار غلام حیدر خاں کو خط تحریر کرتے ہوئے سید احمد شہیدؒ فرماتے ہیں کہ:

"اس صورت میں مناسب وقت یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ سردار والاقدر راجہ ہندو راؤ کو یہ بات سمجھائیں کہ ہندوستان کا بہت بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں پہنچ گیا ہے۔ ان لوگوں نے ہر جگہ ظلم و جبر کی بنیاد قائم کر دی ہے۔ رؤساء ہند کی ریاست برباد ہو گئی ہے۔ کوئی شخص مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا بلکہ ہر شخص ان کو اپنا آقا تصور کرتا ہے۔

چونکہ بڑے بڑے صاحب ریاست ان کے مقابلے کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں ناچار چند کمزور ناچیز کمر ہمت کس کر کھڑے ہوئے ہیں۔ پس اس صورت میں رؤساء عالی مرتبت پر لازم ہے کہ جس طرح وہ سالہا سال مسندِ حکومت پر متمکن رہے ہیں فی الحال ان کمزور فدا کاروں کی امداد میں پوری پوری کوشش کریں اور اس کو خود اپنی حکومت کی مضبوطی کا ذریعہ سمجھیں۔"

یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اگر انقلابیوں کی اس عارضی حکومت کو، جو بدقسمتی سے حقیقی

خدا گواہ ہے

"ہمارا منشا دولت جمع کرنا ہے نہ حکومت قائم کرنا"

حکومت کا روپ نہ دھار سکی ، کامیابی سے کام کرنے کا موقع مل جاتا تو یقیناً وہ حکومت شاہ ولی اللہؒ مجدد دہلوی کے تصور کے عین مطابق ہوتی ۔

شاہ ولی اللہؒ نے اپنی مشہور کتاب البدور البازغہ " میں ترقی پذیر متمدن حکومت کے تقاضوں اور ضرورتوں کا تجزیہ کرکے انہیں پانچ شعبوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پھر وہ (شاہ ولی اللہؒ) رنگ و نسل ، خاندان اور فرقہ کے امتیاز سے بالاتر ایسے ماہرین کی تلاش کرتے ہیں جو صلاحیت اور قابلیت کے اعتبار سے ہر ایک شعبہ کے علیحدہ علیحدہ ذمہ دار بن سکیں ۔

سربراہ حکومت کے لئے وہ ایسے شخص کو منتخب کرنا چاہتے ہیں جس میں ان تمام شعبوں (PORTFOLIO) کی نگرانی کی مکمل صلاحیت ہو ۔ ایسے جامع الصفات شخص کو انہوں نے "الامام الحق" کا نام دیا ہے ۔ ایسے کامل رہنما کی متبادل صورت پیش کرتے ہوئے وہ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ :

" چند ارباب دانش ، صاحب تجربہ ، ماہرین اور یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر عوام کے مقبول اور منتخب جماعت (پارلیمنٹ اور کابینہ) حکومت کی ذمہ دار ہوگی "

انقلابی فوج کا کردار :

انقلابی فوج کے فدائین جو اپنا دھن ، دولت اور جائیداد سب کچھ قربان کرکے سید احمد شہیدؒ کے لانگ مارچ میں شامل ہوئے تھے حق اور اعلاء کلمۃ الحق کے مقابلہ میں وہ اپنی تمام تمنائیں آرزوئیں جذبات اور مفادات بھی ترک کر چکے تھے ۔

ان مجاہدین میں یہ روح کس طرح کارفرما تھی اس بات کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ " اکوڑہ " پر شب خون کے لئے مجاہدین کی فہرست تیار کی جا رہی تھی ، عبدالمجید خاں آفریدی ساکن جہان آباد ضلع رائے بریلی اس لئے فہرست میں شامل نہیں کئے گئے کہ بخار میں مبتلا تھے ۔ عبدالمجید خاں کو خبر ملی تو بے تاب ہو کر سید احمدؒ شہید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گریہ زاری کے ساتھ عرض کرنے لگے " حضرت ! میں ایسا بیمار تو نہیں ہوں کہ چل نہ سکوں یہ اللہ کے نام پر پہلا معرکہ ہے ، کیا میں سبقت کی فضیلت سے محروم رہ جاؤں گا ؟ " سید صاحب نے جذبہ ایثار کی یہ بے تابی دیکھی تو فہرست میں نام شامل کر دیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ ہمت میں برکت دے ۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ اسی شب خون میں یہ شہید بھی ہو گئے لیکن اس طرح کہ چودہ سپاہیوں کو ختم کرنے کے بعد ان کی تلوار ٹوٹ گئی ۔ نرغہ میں گھر کر زخموں سے چور ہوئے اور جام شہادت سے شوق و ذوق کی تشنہ لبی کی سیرابی کی ۔

دیوبند کے مجاہدین میں شیخ بلند بخت اور ان کے بھائی محمد علی بھی تھے ۔ ایک معرکے میں محمد علی شہید ہو گئے ۔ شیخ بلند بخت کو بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو فرمایا الحمد للہ جو مراد لے کر گئے تھے وہ پوری ہو گئی ۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے ۔

سید احمد شہیدؒ کی فوج کا ایک فدائی دوران جنگ زخمی ہو کر گرا تو بے اختیار اس کی زبان سے نکلا ۔ فزت برب الکعبۃ (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا ۔

جنگ سیدو میں شکست کے بعد منتشر شدہ انقلابی جنگلی کے مقام ، جہاں سید احمد شہیدؒ کو بے ہوشی کے عالم میں پہنچا دیا گیا تھا ، جمع ہوئے تو آب و ہوا کی ناموافقت کے باعث اکثر مجاہد بیمار پڑ گئے اور روزانہ ایک ایک دو دو وفات پانے لگے ۔ دوسری طرف معاش کی تنگی انتہا کو پہنچ گئی ۔ سینکڑوں میں صرف چھ سات تندرست تھے ۔ وہ دن رات تیمارداری میں مصروف رہتے تھے ۔

سید رستم علی جل گانوی ، اکوڑے میں زخمی ہوئے ۔ دو ڈھائی مہینے نوشہرہ میں صاحب فراش رہے ۔ جنگلی پہنچنے پر ان کی صحت پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی کہ تنہا چالیس بیماروں کا بوجھ اٹھا لیا اور اس خوبی سے خدمت کی کہ کسی کو بھی ذرا سی تکلیف نہ ہونے دی ۔

عسرت کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص کو روزانہ صرف مٹھی بھر جوار ملتی تھی ۔ تندرست غازی اسے پیس کر روٹی پکاتے اور بیماروں کے لئے ابال کر دلیہ بنا دیتے ۔ لیکن عسرت اسی پر ختم نہ ہوئی ۔ جلدی وہ وقت آ گیا کہ مٹھی بھر جوار بھی میسر نہ آ سکی تو یہ انقلابی مسلمان باہر جنگل میں نکل جاتے اور ایسی جڑی بوٹیاں یا پتے تلاش کرتے جو کھانے میں بدمزہ نہ ہوں اور پانی میں جوش دینے سے گل جائیں ۔ انہی چیزوں کو بڑی بڑی ہانڈیوں میں ابالتے اور نمک ڈال کر خود بھی کھاتے اور بیماروں کو بھی کھلاتے ۔ اسی حالت میں جن کی وفات ہوئی ان کے کفن کے لئے کپڑا میسر نہیں تھا ۔ اگر ان کے پاس چادریں ہوتیں تو انہی کا کفن بنا دیا جاتا ورنہ جامہ کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر اسے کام میں لاتے ۔

عارضی حکومت کے جو محصوصات مقرر کئے گئے تھے ان کے وصول کرنے والوں کا کردار یہ تھا کہ دورے پر نکلتے تو آبادی سے نصف میل پر ٹھہر جاتے اور گاؤں کے سرداروں کو باہر ہی بلا کر حالات پوچھ لیتے ۔ سواروں کو بستی میں جانے یا کوئی چیز مانگنے کی سخت ممانعت تھی ۔ ایک مرتبہ ایک سوار نے موضع ڈاگئی میں کسی سے چھاچھ مانگ لی ۔ رسالدار عبدالمجید خان سخت ناراض ہوئے ۔ گاؤں والوں نے کہا یہ معمولی بات ہے ۔ لیکن رسالدار نے اس سوار سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو ضابطہ کی پابندی کیجئے ورنہ امیرالمومنین کے پاس چلے جائیے ۔

اسی طرح ایک مرتبہ دو سواروں نے کسی سے شکر مانگی ۔ اس نے جواب دیا کہ شکر تو نہیں گڑ موجود ہے ۔ سوار غصہ میں آ گئے ۔ رسالدار کو اس واقعے کا علم ہوا تو دونوں سواروں کے بیس بیس تازیانے لگوائے ۔

فوجیں جب مارچ کرتیں تو راستے کے آس پاس کے کھیتوں کو تباہ کر دینا عام بات تھی ۔ دیہات سے جو چاہتے لوٹ لیا کرتے تھے مگر سید احمد شہیدؒ کے انقلابی لشکر نے پشاور پر حملہ کے وقت لانبا راستہ طے کیا تو احتیاط کا یہ عالم تھا کہ لوگ پکار اٹھے کہ

" یہ عجیب لشکر ہے کہ اگرچہ چھ سات ہزار

سوار و پیادے اُترے ہوئے ہیں مگر کسی پر ظلم نہیں کرتے۔"

میمنی میں جب انقلابی مجاہدین کو قاتلانہ حملے کا نشانہ بنانا پڑا تو ان میں بنیر کا ایک نوجوان بھی تھا۔ بلوائی بار بار اُسے آوازیں دیتے تھے کہ تم ہماری قوم سے ہو، ہندوستانیوں سے الگ ہو کر ہمارے پاس چلے آؤ۔ اس نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ مجاہدین کے ساتھ شہید ہو جانا ہزار درجہ بہتر ہے۔ تمہارے ساتھ جینا منظور نہیں۔

جنگ سیدو کے موقع پر انقلابی مسلمانوں کے امیر حضرت سید احمد شہیدؒ کو زہر دینے کا واقعہ مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور قانونی، ہر لحاظ سے افسوسناک، شرمناک اور سنگین تھا۔ زہر دینے والے سازشیوں کو جو سزا بھی دی جاتی کم تھی لیکن سید احمد شہیدؒ کا عفو و اغماض اور شان درگذر سب سے بالا تھی۔ چنانچہ نذر محمد اور ولی محمد جو یار محمد خان کے خانساماں تھے اور کھانا لانے پر مامور تھے کو جب مجاہدین نے گرفتار کر کے انہیں سزا دینی چاہی، معاف کر دیا۔ وہ وطن جا رہے تھے۔ راستہ میں پٹھانوں نے دوبارہ گرفتار کر لیا اور ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک جھونپڑے میں ڈال دیا کہ ان کا سردار آجائے تو ان کا سر قلم کر کے دل ٹھنڈا کریں۔

اتفاقاً سید احمد شہیدؒ کا گذر اس طرف ہوا تو انہیں بھی خبر کر دی گئی۔ اسی اثنا میں پٹھانوں کا سردار بھی پہنچ گیا اور سید موصوف سے درخواست کی کہ وہ وہاں سے تشریف لے جائیں۔ ہم ان کو سمجھیں گے۔ یہاں حکم دینے کا موقع نہ تھا۔ آپ نے خوشامد کر کے انہیں خان کے پنجے سے چھڑوایا اور رات کے اندھیرے میں ان کو باہر بھجوا دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاقی اور روحانی تربیت کے ماحول میں دس بارہ برس رہنے کے بعد سید قافلہ کا ہر ایک مجاہد اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار کی مثال بن گیا تھا۔ نواب وزیر الدولہ رقم طراز ہیں کہ

"خدا کی رحمت سے اس تقویٰ شعار لشکر کا اخلاص اس مرتبہ پر پہنچا ہوا تھا کہ اگر ایک سپاہی کے اخلاص اور للہیت کی تعریف کی جائے تو انہیں پورا کرنے کے لئے لمبا چوڑا دفتر درکار ہوگا۔"

اس لشکر کے بچے کھچے افراد سرحد سے واپسی پر جہاں کہیں پہنچے وہاں کے معاشرے میں انہوں نے انقلاب پیدا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی حکومت کے بے پناہ پروپگنڈے کے باوجود اس تحریک کے تیس سال بعد ۱۸۵۷ء کا جہاد حریت برپا ہوا تو اس کے ماننے والوں کے دم خم وہی تھے۔

انقلابی حکومت کے مخالفین:

سید احمد شہیدؒ کی انقلابی فوج اور حکومت کا اصل مقابل برطانوی سامراج تھا جسے ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے لئے انہوں نے اپنا تن، من، دھن سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ چنانچہ سامراج اور اس کی معاون قوتیں ان کی انقلابی جدوجہد کی راہ روکنے کے لئے اپنی پوری قوت جبر کے ساتھ میدان میں نکل آئیں۔ یہ قوتیں درج ذیل تھیں:

۱۔ سکھ:

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تمام فاتحانہ اولوالعزمیاں انگریزوں سے چشم پوشی کر کے پٹھانوں اور انقلابی فوج پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ ۱۸۲۴ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور فتح کرنے کے بعد یار محمد خان کو وہاں کا باجگزار حاکم مقرر کر دیا تھا۔ یوسف زئی کا علاقہ جہاں سید احمد شہیدؒ نے اپنی انقلابی حکومت بنائی تھی آزاد تھا مگر پشاور کی فتح کے بعد مہاراجہ کی کی نظریں اسی علاقہ پر لگی ہوئی تھیں۔

انقلابی مسلمانوں اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درمیان ایک نظریاتی تصادم اس وقت سے چلا آ رہا تھا جب مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر اور امیر علی خان انگریزوں سے لڑتے ہوئے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور سکھ سرداروں سے امداد حاصل کرنے امرتسر پہنچے تھے اور نہ صرف ناکام واپس ہوئے تھے بلکہ "لیپل گرفن" کی روایت اگر درست ہے تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انگریزوں سے یہ معاہدہ بھی کر لیا تھا کہ ہلکر کو امرتسر سے تیس کوس پرے ہٹا دیں گے اور آئندہ اس سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔

سید احمد شہیدؒ کی دور بین نگاہیں نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ کے مقابلہ میں پورے ایشیاء کے اتحاد پر تھیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ وحدت ہند تو درکنار سکھوں کی متحدہ حکومت کے نظریہ سے بھی دستبردار ہو کر ستلج پار کے علاقے (جس میں پٹیالہ، نابھہ، جیندا اور کپورتھلہ وغیرہ کی ریاستیں تھیں) پر انگریزی بالادستی تسلیم کر چکا تھا۔

اگر میجر باسو کا یہ الزام صحیح ہے کہ

"انگریزوں نے سکھوں کو بڑھایا تاکہ وہ سندھیا کا مقابلہ کر سکیں۔ اس لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ انگریزوں سے ملا رہا اور ان کا شکر گزار رہا۔"

تو سید احمد شہیدؒ اور رنجیت سنگھ کے درمیان وہی نظریاتی تصادم تھا جو مہاراجہ سندھیا اور انگریزوں کے درمیان تھا اور گمان اغلب ہے کہ یہی وجہ تھی سید احمد شہیدؒ نے مہاراجہ دولت راؤ کو خاص طور پر مسلمانوں کی انقلابی تحریک کی امداد کے لئے متوجہ کیا تھا۔

۲۔ شاہ پرست مسلمان

سید احمد شہید اور انقلابی مسلمان جو شاہ ولی اللہؒ کے مصلحانہ نظریات اور ہمہ گیر سیاسی اور سماجی سماج کے لئے نبرد آزما تھے، ملوکیت اور بادشاہت کے بدترین مخالف تھے جب کہ یار محمد خان جیسے خوانین شاہ پرست مسلمانوں میں سے ایک تھے۔ اس وجہ سے یہ مبالغہ نہ ہو گا اگر کہا جائے کہ یار محمد خان اختلاف مذہب کے باوجود سید احمد شہیدؒ کے مقابلے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زیادہ قریب تھا۔

چنانچہ جنگ سیدو کے موقع پر جب مجاہدین کی طاقت نقطۂ عروج پر تھی (سردارانِ پشاور، سرداران سمہ اور انقلابی مسلمانوں کو ملا کر تقریباً ایک لاکھ افراد کا لشکر سید احمد شہیدؒ کی زیر قیادت تھا) خوانین پشاور نے پہلے

سید احمد شہیدؒ کو زہر دلوایا اور جب ان کی بیہوشی کے باوجود جنگ نہ ٹلی اور مجاہدین کا پلہ میدانِ جنگ میں بھاری رہا تو سرداران پشاور اپنی فوج لے کر جنگ سے علیحدہ ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کا سارا دباؤ مہاجرین پر آپڑا اور ہزار ہا مہاجرین شہید ہو گئے۔ اس کے بعد بقول مصنف سید احمد شہیدؒ

"اب مسلمانوں کا مستقل دو حریفوں سے مقابلہ تھا۔ ایک سکھ اور دوسرے سرداران پشاور۔ خادی خاں[1] کے تیور بھی اس گاؤں[2] کے معاملہ کے بعد بدل گئے اور وہ انتقام کا موقع ڈھونڈتا تھا۔ اب یہ سید احمد شہیدؒ کی جماعت کے دشمن اور علانیہ حریف تھے۔

انگریزی سامراج:

یہ انقلابی فوج کی بدقسمتی تھی کہ اسے بیک وقت ان دو دشمنوں کا جنگی محاذ پر مقابلہ کرنا پڑا۔ ان دو حریفوں کے علاوہ انقلابیوں کا تیسرا اور سب سے خطرناک دشمن انگریز تھا۔ اس نے سیاسی ڈپلومیسی سے توپ و تفنگ استعمال کئے بغیر صرف لفظوں کے استعمال سے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جو سکھ اور شاہ پرست مسلمان نہ پہنچا سکے تھے۔

انگریزوں نے اپنا عظیم اصول "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" انقلابی مسلمانوں کے خلاف خوب استعمال کیا اور ایک شاطرانہ مثال قائم کی۔

جب تک سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا تعلق انگریزی مقبوضات سے صرف رنگروٹ بھرتی کرنے اور سرمایہ فراہم کرنے تک محدود رہا، انگریزی حکومت کے ذمّہ داروں نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ بعض انگریزوں نے اس کی حمایت کی۔ چنانچہ سید صاحب کے قافلہ کی دعوت کرنے والوں میں جہاں ہندو اور مسلمانوں کے نام ہیں وہاں ایک انگریز کا نام بھی ملتا ہے جس نے پورے قافلے کے لئے کشتیوں پر کھانا پہنچایا تھا۔

علاوہ ازیں کلکتہ میں مولانا محمد اسمٰعیل کے وعظ میں جہاں ہندو مسلمانوں کا اجتماع ہوا کرتا تھا وہاں انگریز اور ان کی بیگمات بھی ان اجتماعات میں شریک ہوا کرتی تھیں۔

جہاد پر جانے سے قبل سید احمد شہیدؒ نے براہ دُور اندیشی شیخ غلام علی رئیس الہ آبادی معرفت نواب لیفٹننٹ گورنر بہادر اضلاع شمالی و مغربی کو بھی اس تیاری جہاد کی اطلاع دے دی تھی جس کے جواب میں صاحب ممدوح نے فرمایا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو، ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں۔

ڈاکٹر ہنٹر اسی ضمن میں "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے صفحہ ۳۲ پر رقمطراز ہے کہ

"ایک انگریز تاجر نے جو شمالی مغربی صوبہ میں تیل کی بہت بڑی تجارت کرتا تھا، مجھے بتایا کہ اس کے بہت سے دیندار مسلمان ملازمین کا یہ عام قاعدہ تھا کہ وہ اپنی تنخواہ کا معیّن حصّہ ستیانہ کیمپ کے لئے علیحدہ کر دیا کرتے تھے اور جو ان سے زیادہ جوشیلے اور بہادر تھے جس طرح کبھی کبھی اس کے ہندو ملازم اپنے باپ کی برسی منانے کے لئے ہر سال چھٹی کی درخواست کرتے تھے۔ اسی طرح اس کے مسلمان ملازم جو تیل کی تجارتی کوٹھی میں کام کرتے تھے ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۶ء کے درمیان اسی عذر کی بنا پر ایک یا دو مہینے کی چھٹی کی درخواست کرنے کے عادی تھے کہ انہیں اپنے مذہبی فریضے کی ادائیگی کے لئے ہلالی فوج میں بھرتی ہونا تھا۔

سر سید احمد خاں جن کا نمایاں کارنامہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان پیدا شدہ غلط فہمیوں اور الجھنوں کو کم کرنا تھا نیز جنہوں نے اس دور میں مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار ثابت کرنے کی کوشش کی اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اس زمانہ میں علی العموم مسلمان لوگ عوام کو سکھوں پر جہاد کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے جمع ہو گیا۔ مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی۔ گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ تم کو دست اندازی نہ کرنا چاہئے دہلی کے ایک مہاجن نے جہادیوں کا روپیہ غبن کیا تو ولیم فریزر کمشنر دہلی نے ڈگری دی جو وصول ہو کر سرحد بھیجی گئی۔

۱؎ خادی خاں قلعہ ہنڈ کا سردار تھا۔ یہ قلعہ دریا "اباسین" کے پُرفضا کنارہ پر بادشاہی شان و شوکت کی یادگار تھا۔ خادی خاں پہلے اتنا معتقد ہوا کہ سید احمد شہیدؒ اور آپ کے تمام رفقاء کو قلعہ ہنڈ میں لے گیا اور وہیں قیام پر اصرار کیا لیکن جب ایک موقع پر سید صاحب کا فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہوا تو وہ ان کے درپے آزار ہو گیا۔

۲؎ موضع مان پری کا گاؤں کے جھگڑے میں جو مالکان اراضی اور کاشتکاروں کے درمیان تھا تقریباً ایک صدی سے جنگ چلی آرہی تھی۔ بقول مصنف سوانح احمدی فریقین کے تین چار ہزار آدمی اس جھگڑے میں قتل ہو چکے تھے۔ جب اس علاقہ میں سید احمد شہیدؒ کی خلافت کے احکامات نافذ ہوئے یہ معاملہ ان کی عدالت میں پیش ہوا۔ تحقیق و تفتیش کے بعد سید صاحب نے مالکان اراضی کے دعویٰ کو جائز اور صحیح قرار دیا اور فریق ثانی سے جبراً تخلیہ کرا دیا۔ خادی خان فریق ثانی کا حامی تھا۔ اس کو زک اٹھانی پڑی اور جیسا کہ خود نما اغراض پرستوں کا قاعدہ ہوتا ہے اس کو نہ صرف عدالت سے بلکہ سید احمد شہیدؒ کے پورے نظام سے ہی نفرت ہو گئی۔

ڈاکٹر ہنٹر کے خیال میں انگریزوں کی انقلابی مسلمانوں سے اس رویہ (چشم پوشی) کی وجہ ان کی لاپرواہی، عدم واقفیت اور غفلت تھی، کیونکہ مسلمانوں کی یہ تحریک انتہائی رازدارانہ تھی۔ مگر حقیقت اس کے برعکس تھی کیونکہ یہ اغماض اور لاتعلقی انگریز کی ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت برتی جا رہی تھی کیونکہ اس طرح۔

۱۔ مسلمانوں کا ایک مخالف عنصر (انقلابی مسلمان) مقبوضات سے باہر جا رہے تھے۔

۲۔ سید احمد شہیدؒ نے اپنی تحریک کے لئے جو خطۂ زمین منتخب کیا تھا وہ بھی انگریزی عملداری سے باہر تھا۔

۳۔ انگریزوں کے لئے مشکل نہ تھا کہ وہ حریت پسندوں کے ایک لشکر میں میر جعفر اور میر صادق داخل کر کے مسلمانوں کی طاقت کو ان کے مرکز پر ہی مفلوج کر دے۔

۴۔ برطانوی سامراج کے لئے یہ بھی مشکل نہ تھا کہ وہ زماں شاہ جیسے اور چند "شاہ پرستوں" کو سید احمد شہیدؒ کی تحریک میں بغاوت کے جراثیم پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتا اور ان کی تحریک اندرونی بغاوت سے ختم کرا دی جاتی۔

۵۔ انگریزی مقبوضات تک پہنچنے کیلئے انقلابی حریت پسندوں کی راہ میں سکھ حکومت حائل تھی اور انگریزوں کے لئے یہ کام نہایت آسان تھا کہ جس طرح روہیلوں کو شجاع الدولہ کے ذریعے اور سلطان ابوالفتح علی المعروف سلطان ٹیپو کو نظام حیدر آباد اور مرہٹوں کی امداد سے شکست دی گئی تھی مسلمانوں کو اس طاقت کو بھی ختم کرا دیا جاتا۔

اِن اسباب کی روشنی میں اسے انگریزوں کی غفلت اور لاپرواہی قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ ان کا تدبر تھا کہ اپنے مقبوضات میں انہوں نے سید احمد شہیدؒ کی تحریک پر کوئی توجہ نہ دی کیونکہ اس طرح انہوں نے رواداری، انصاف پسندی اور فراخ حوصلگی کی نمائش کی اور کوئی غیر معمولی طاقت استعمال کئے بغیر دشمن کو ختم کرنے کی پالیسی اختیار کی۔

چنانچہ اس حقیقت سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برطانوی سامراج نے وہابیت کا الزام تراش کر مسلمانوں کی اس جدوجہد کو اتنا شدید نقصان پہنچایا کہ ایسا نقصان نہ سکھوں کی ٹڈی دل فوج پہنچا سکی اور نہ یار محمد خاں کی مسلح طاقت۔

"وہابیت" کے زہریلے پروپگنڈے سے خود مسلمانوں کے ہاتھوں انگریزوں نے سید احمد شہیدؒ کے لشکر کے ایک بڑے حصّہ کو ایک رات میں ہی ذبح کرا ڈالا کیونکہ وہابیت کی حقیقت سے نہ مہاراجہ رنجیت سنگھ واقف تھا اور نہ یار محمد خاں میں یہ شعور تھا۔ یہ شعور اور وہابیت کے نفرت انگیز اثرات سے صرف انگریز ہی آشنا تھا جنکے کچھ جہاز (تجارتی) ۱۸۰۹ء میں وہابیوں نے خلیج فارس سے گزرتے ہوئے لوٹ لئے تھے۔ پھر انگریزوں کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ وہابیوں کی طرف سے مشرق وسطیٰ، افریقہ اور ایران میں کتنی نفرت پھیلی ہوئی ہے۔

بقیہ: تاج المحدثین

جس روز مرض الموت شروع ہُوا، اُسی دن آپ نے مولوی سید احمد صاحب سے فرمایا: میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ ایک مکان میں ہوں جس کے نیچے تہہ خانہ ہے اور اس کی چھت تختوں سے پٹی ہے۔ اس میں سے دو تختے نیچے کو جھکے ہیں اور نکل گئے ہیں۔ میں بہت سہولت سے اس تہہ خانہ میں اتر رہا ہوں۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بہت بڑا اور اچھا چُونا قلعی کیا ہُوا روشن مکان ہے۔ اس میں ایک طرف دروازہ ہے جس سے روشنی آتی ہے۔ پھر میں واپس جانے کا ارادہ انہی تختوں کی طرف سے کر رہا ہوں جدھر سے آیا ہوں۔"

اتنا کہنے کے بعد فرمایا: اس کے بعد میرا خیال دوسری طرف چلا گیا اور پھر آنکھ کھل گئی"۔ پھر خود ہی تعبیر بتائی کہ وقت تو جب کبھی آئے مگر یہ میرے لئے بشارت ہے کہ انشاء اللہ قبر میں سہولت ہو گی اور وہ دروازہ۔ دروازۂ جنت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔

مولانا سید احمد صاحب خواب اور تعبیر سُن کر جب باہر چلے گئے تو آپؒ نے اہلیہ کو پاس بلایا اور التجا کے درجے میں یہ کہا کہ جو کچھ تمہارے حقوق میرے ذمّے ہوں یا میں نے تم کو برا بھلا کہا ہو، وہ سب اللہ واسطے معاف کر دو۔ اس کے بعد ان کے بھائی حاجی مقبول احمد سے کہ مدت سے حضرت کے پاس رہتے تھے، فرمایا: میں تم پر بہت مرتبہ خفا ہوا ہوں اور اکثر برا بھلا کہا ہے تم بھی معاف کر دو۔ آخر زمانے میں اہلیہ کے ساتھ حسنِ معاشرت بہت بڑھ گیا تھا اور ان کی دلدہی زیادہ فرمانے لگے تھے۔ ایک مرتبہ اہلیہ سے کہا: مدینہ منوّرہ میں رہ کر یہاں کے مصائب اور تکلیف پر اگر کوئی صبر کرے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: میں خاص طور پر اس کی شفاعت کروں گا۔" اہلیہ نے عرض کیا: مجھے تو کوئی تکلیف یا مصیبت نہیں ہے۔ میں تو بحمد اللہ بہت راحت سے ہوں"۔ فرمایا: آخر کچھ تو ہے ہی۔ یہی روٹی ٹکڑے کی۔ غرض بات کو ٹال دیا لیکن انہیں چند ہی روز بعد بیوہ بننے پر معلوم ہوا کہ مصیبت کیا چیز ہے اور اس پر صبر کس قدر کٹھن، مگر اللہ رے ہمّت کہ شوہر کی آخری وصیت پوری کر دکھائی کہ غربت و تنہائی کے عالم میں یکایک دنیا آنکھوں میں تاریک ہو گئی اور پچاس برس کا ساتھ چھوٹ گیا لیکن نہ چیخ نکالی نہ آہ و زاری کی۔ کلیجہ تھام کر بیٹھ گئیں۔ اور صدمہ برداشت کر لیا۔

اس دَورِ آخر میں آپ کا اندرونی سوز و گداز بہت بڑھ گیا تھا کہ ضبط نہ فرما سکتے اور بات بات پر رقت و گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ ایک بار بزرگوں کی عمروں کا ذکر ہو رہا تھا۔ فرمانے لگے: اگر دو سال اور زندہ رہا تو اپنے شیخ (مولانا گنگوہی) کی عمر کو پہنچ جاؤں گا۔" اتنا کہہ کر رو دئے پھر فرمایا "سب چلے گئے، میں ہی رہ گیا۔" ایک مرتبہ کسی نے پوچھا: حضرت اب وطن واپس جانے کا کب ارادہ ہے؟" آبدیدہ ہو کر کہا: بھائی، اب تو ارادہ بقیع کا ہے۔" آخرت کا، قیامت کا یا بزرگوں کا جب بھی ذکر آتا تو رونے لگتے اور آواز بھرا جاتی۔ ایک بار بزرگوں کے ذکر پر فرمایا: بھائی وہ بڑے لوگ تھے، میں تو کچھ بھی نہیں۔ لوگوں

طلباء کی سرگرمیاں — ترتیب محمد ادریس

کعبۃ اللہ پر قبضہ کی ناپاک جسارت ایک گہری سازش ہے

— ندیم اقبال اعوان —

جمعیۃ طلباءِ اسلام پاکستان کے مرکزی ناظم جناب ندیم اقبال اعوان نے کعبۃ اللہ پر قبضے کے سانحے پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"یہ قبضہ اسلام دشمن قوتوں کے منظم منصوبہ کی ایک کڑی ہے۔" انہوں نے کہا: "عالمِ اسلام کے جذبات سے کھیلنے کی ناپاک جسارت اور مرکزِ اسلام کی بے حرمتی کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سانحہ دینی قوتوں اور اسلامی حکومتوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ دینی قوتوں اور اسلامی ممالک کو ایسی سازشوں کا مقابلہ کرنے اور ایسے حالات سے نمٹنے کے لئے مکمل اتحاد اور یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے۔"

انہوں نے مزید کہا:

"مرکزِ اسلام پر اس ناپاک جسارت سے سبق سیکھتے ہوئے اور حالات کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے مسلم ممالک کو مرکزِ اسلام کے تحفظ کے ساتھ ساتھ بیت المقدس کی آزادی کے لئے منظم تحریک شروع کر دینی چاہیئے۔"

صوبہ سندھ کی عاملہ کے دورے کا پروگرام:

فیصلے کے مطابق صوبائی مجلس عاملہ کے اراکین دسمبر میں اپنے تفصیلی دورے کا آغاز کریں گے۔ اس دوران وہ تنظیمی کارکردگی کا جائزہ لیں گے اور نئی تنظیمیں قائم کریں گے۔ ساتھیوں کو کام کو مزید بہتر بنانے کے لئے ہدایات دیں گے۔

حسب پروگرام

جناب بشیر احمد قریشی اور
جناب ارشد نوناری سکھر ڈویژن کا دورہ کریں گے، جبکہ
جناب اسلم وسیر اور
جناب عبدالغنی انصاری حیدرآباد ڈویژن کا دورہ کریں گے؛
اور جناب نور احمد سندھی کراچی ڈویژن کا دورہ کریں گے۔

صوبہ سندھ کا ماہانہ خبرنامہ:

- جمعیۃ طلباءِ اسلام پاکستان صوبہ سندھ کی طرف سے نکالے گئے ماہانہ سرکلر میں تمام ضلعی شاخوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ درسِ قرآن و حدیث کا خاص اہتمام کریں اور ہفتہ وار، ماہانہ اجلاس باقاعدگی سے منعقد کریں۔
- عمومی و شوریٰ کے اراکین ۵/- روپے اور عاملہ کے اراکین ۱۰/- روپے ماہانہ صوبائی دفتر کو باقاعدگی سے ارسال کریں۔
- صوبائی صدر جناب نذیر احمد پھوار نے طویل فرصت کے بعد اپنی ذمہ داریاں پھر سے سنبھال لی ہیں۔
- صوبہ سندھ کی عاملہ کے اجلاس میں جناب الطاف حسین کے والدِ گرامی کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور مرحوم کے

لئے دُعائے مغفرت کی گئی۔

صدی هجری کی تقریبات

عالم اسلام میں صدی ہجری کی تقریبات کے آغاز کا اعلان ہو چکا ہے، اور مختلف ممالک مختلف تنظیمیں اور جماعتیں اپنے اپنے طریق سے اس کا اہتمام کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں جمعیۃ طلباء اسلام

صدی هجری کی تقریبات

میں بھرپور حصہ لے گی۔
ان تقریبات کے منانے کے لئے ایک جامع اور منظم منصوبہ بھی زیر غور ہے۔

جمعیۃ طلباء اسلام

کے ساتھیوں سے درخواست ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنی تجاویز ارسال کریں تاکہ بہتر طریقے سے

صدی هجری کی تقریبات

میں بھرپور شرکت کی جاسکے۔

مرکز سے مکمل رابطہ رکھیں:

گذشتہ چند ہفتوں سے اضلاع اور شاخوں کی کوئی رپورٹیں موصول نہیں ہو رہی ہیں؛ اور اکثر جماعتیں مرکز سے رابطہ میں انتہائی گستی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ یہ طرزِ عمل تنظیمی لحاظ سے نقصان دہ ہے۔

تمام شاخیں اور اضلاع اپنے ہفتہ وار اور پندرہ روزہ پروگرام باقاعدگی سے منعقد کریں اور اپنی کارکردگی اور رپورٹوں سے مرکز کو پوری طرح باخبر رکھیں۔ اسی طرح مرکز کی طرف سے دی گئی ہدایات پر عمل کریں۔

ندیم اقبال اعوان کا دورۂ سندھ: (بقیہ رپورٹ)

۸ نومبر کو مرکزی قائد جناب ندیم اقبال اعوان کراچی پہنچے۔ مرکزی ناظم عمومی نے ۸ نومبر کو صوبہ سندھ کی عاملہ کا اجلاس طلب کیا تھا۔ وہ حسب پروگرام ڈاکٹر ایم۔ای۔جاوید کی رہائش گاہ پر ہوا۔ اجلاس میں صوبائی کارکردگی کا مفصل جائزہ لیا گیا، اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ صوبہ سندھ کی عاملہ کے ارکان دسمبر میں صوبہ سندھ کا تفصیلی، تنظیمی اور تربیتی دورہ کریں گے۔

حلقہ برنس روڈ اور گلشن اقبال میں طلباء سے خطاب:

صوبائی عاملہ کے اجلاس کے بعد مرکزی ناظم عمومی اور صوبائی صدر نے حلقہ برنس روڈ اور گلشن اقبال کا دورہ کیا، جہاں انہوں نے طلباء کے عمومی اجتماع سے خطاب کیا اور تنظیمی کارکردگی کا معائنہ کیا۔

علاوہ ازیں جمعیۃ طلباء اسلام کے سابق مرکزی ناظم عمومی جناب محمد فاروق قریشی صاحب کی طرف سے دی گئی ضیافت میں شرکت کی۔

ایجنسی ہولڈر، خریدار اور قارئین حضرات!!!

۱۔ ادارہ کو رقم ارسال کرتے وقت وی پی کی تاریخ درج کرنا نہ بھولئے۔

۲۔ پتہ مکمل اور صاف تحریر کیجئے، نیز پتہ میں ڈاکخانے اور تحصیل کی ضرور وضاحت کیجئے اور حتی الامکان پتہ مختصر ہو۔

۳۔ مستقل خریدار اور ایجنسی ہولڈر ادارے سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر مع تاریخ کے ضرور لکھئے۔

۴۔ مدت خریداری اس تاریخ سے تصور کی جائے گی جس تاریخ کو (زر سالانہ) وی پی وصول ہو گی۔ نیز یہ کہ ادارہ کو وی پی کی واپسی کا جاری کرکے وی پی وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہے۔

جواب طلب امور کے لئے چالیس پیسے کے ڈاک ٹکٹ یا جوابی خط ارسال کیجئے۔

اکابر سے خصوصی دعا کی اپیل

اللہ تعالیٰ نے پانچ بچیوں کے بعد اپنے فضل و کرم سے ایک فرزند ارجمند فرمایا۔ میں نے اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق اسے اکابر کے مشن پر چلانے کا تہیہ کیا اور اسکا نام "شمس الدین" مولانا شمس الدین شہید کے نام پر رکھا۔ دوسرا فرزند ۲۱ ستمبر ۱۹۷۹ء کو پیدا ہوا جسکا نام "شمس الحق" مولانا شمس الحق افغانی کے نام پر رکھا گیا ہے۔

اکابر سے اپیل ہے کہ میرے ان فرزندوں کیلئے خصوصی دعا فرمائیں، تاکہ وہ ان اکابر کے نام کی لاج رکھتے ہوئے اکابر دیوبند کے مشن کی تکمیل کریں۔

محمد یونس (نان بائی)، نیوڈگری پشاور